احباب مطلع رہیں!

ان شاء اللہ العزیز ——— نئے تعلیمی سال سے

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام' ماڈل ٹاؤن لاہور میں

قرآن کالج گرلز ونگ

کا اجرا کیا جا رہا ہے۔ جہاں :

☆ طالبات کو چھٹی کلاس سے ایف اے تک تعلیم کی سہولت مہیا کی جائے گی

☆ سکول و کالج کے مروجہ نصاب کے علاوہ دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام بھی ہو گا

فرسٹ ایئر میں داخلے اسی سال سے جبکہ چھٹی کلاس میں آئندہ سال اوپن کیے جائیں گے

المعلن : ناظم کالج' 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

حسب معمول ——— ان شاء اللہ العزیز ——— امسال بھی

میٹرک کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے

قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس

191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں

17 مئی تا 12 جون 99ء

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

کا اہتمام کیا جائے گا ——— مزید تفصیلات کے لئے رجوع کیجئے :

ناظم قرآن کالج 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۸ — محرم الحرام ۱۴۲۰ھ — مئی ۱۹۹۹ء — شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شادی ہال، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

قرآن کالج کے گرلز ونگ کا قیام

قرآن کالج کو قائم ہوئے دس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے تعلیمی منصوبوں میں قرآن کالج کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ سینکڑوں طلبہ یہاں سے قرآن فہمی پر مشتمل ایک معین دینی نصاب اور بورڈ اور یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق ایف اے، بی اے تک تعلیم مکمل کر کے یا ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کی تکمیل کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں اپنی پروفیشنل مصروفیات کے ساتھ ساتھ اپنی بساط کے مطابق قرآن کے پیغام کو عام کرنے کی سعادت سرانجام دے رہے ہیں۔ ہماری بہت سی limitations کے باوجود بحیثیت مجموعی قرآن کالج، خدمت قرآنی کے ضمن میں مفید خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

گزشتہ کئی برسوں سے رفقاء واحباب کی جانب سے یہ مطالبہ شدت کے ساتھ سامنے آرہا تھا کہ اسی نہج پر ایک کالج طالبات کے لئے بھی قائم ہونا چاہئے۔ اس ضمن میں یہ دلیل بھی دی جاتی رہی کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام زیادہ ضروری ہے کہ اگلی نسل کی تربیت کی ذمہ داری کا بوجھ بھی انہی کو اٹھانا ہوتا ہے۔ یہ دلیل اپنی جگہ بعض افراد کے نزدیک خواہ کچھ زیادہ متاثر کن نہ ہو تب بھی لڑکیوں کی دینی تعلیم اور ان کے لئے کسی ایسے تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت کہ جہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اہتمام ہو، سے انکار نہیں کیا جاسکتا ـــــ الحمدللہ کہ قرآن کالج کی نہج پر لڑکیوں کے لئے تعلیمی ادارے کے قیام کی راہ ہموار ہو چکی ہے اور نئے تعلیمی سال سے ان شاء اللہ طالبات کے لئے فرسٹ ایئر میں داخلے اوپن کر دیئے جائیں گے۔ اس کے لئے ایک الگ مناسب عمارت کی فراہمی کا انتظام بھی اللہ کی جانب سے ہو گیا ہے۔ ایک صاحبۂ خیر نے جو پہلے سے خدمت قرآنی کے کاموں میں اللہ

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

درس ۱۴

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

—— (۱) ——

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۃ الحجرات مکمل ہے یہ عظیم سورت اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملّی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستور اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورت کو بغرض تفہیم تین حصّوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔

پہلا حصّہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے اصل الاصول، یعنی اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی اور ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی[1] کے اصل قوام یعنی "مرکزِ ملّت" سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست 'مادر پدر آزاد'

---

[1] کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے پابند ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی 'مسلمان' قرار دی جا سکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے۔

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل روح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی کی 'اصلِ ثانی' کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یعنی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ سے محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ) اور ہر اُس قول و فعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (ع 'ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر!)

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ توحید فی الالوہیۃ کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرزِ جلی اس کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا — اس کے بالمقابل اصلِ ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں ملّتِ اسلامیہ کے پاس وہ 'مرکزی شخصیت' موجود ہے جس سے تمدّنِ انسانی کی وہ فطری ضرورت بہ تمام و کمال اور بغیر تصنّع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بُت تراشنے اور ہیرو (HEROES) گھڑنے کا کھکھیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو ع

"می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر" کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بُت تراشیں، لیکن ملّتِ اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو" اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ" میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت پوری اُمتِ مسلمہ سے ہے) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، اُمّتِ مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مرکزیت' ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرقِ اقصیٰ سے لے کر مغربِ بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل ولسان کے شدید اختلاف اور تاریخی وجغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENEITY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیٰحدہ علیٰحدہ قیادتوں اور علاقائی 'شخصیتوں' کو بس ایک حد تک ہی اُبھارنا چاہیے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے 'وحدتِ ملّت' کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علاّمہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

رُوئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیارِ قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی وامّی صلّی اللہ علیہ وسلّم۔

مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ تر عقلی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی۔ پہلی پر دستور و قانون کا دارومدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اُس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں 'محصور' ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتّباع کے جذبے سے اس ہیئتِ اجتماعی کو ثقافتی یک رنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبّت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم دِگر بھی جڑے رہتے ہیں۔

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ 'مقام رسالت' کے ذکر میں طولِ کلام فی الواقع ع " لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق ہے)

دوسرا حصّہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّتِ اسلامیہ کے افراد اور

گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف وانتشار اور فتنہ وفساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتہً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدّباب کرتے ہیں۔

مقدّم الذکر احکام دو ہیں: ا۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق وتفتیش اور چھان بین کا اہتمام[1] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل یعنی ل: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمّہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے۔ گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر مُصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریقِ ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئتِ اجتماعیہ کو کرنا چاہیے اور ج: جب وہ گردن جھکا دے تو ازسرِنو عدل وقسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرّر مؤکّد ذکر خاص طور پر اس لیے ہے کہ جب پوری ہیئتِ اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصّے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں اُن چھ معاشرتی برائیوں سے منع فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت وعداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس لیے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔ ا۔ تمسخر (اس کے سدّباب کے لیے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر وقیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں

---

[1] اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ "کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سُنے اُسے آگے بیان کر (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق وتصدیق نہ کرے)

بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳۔ تنابُز بالالقاب یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد بُرائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے) ۴۔ سوءِ ظن (اس لیے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵۔ تجسّس اور ۶۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لیے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ (اس لیے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کرسکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزّت کے تحفّظ پر قادر نہیں ہوتا)

الغرض ان آٹھ اوامر و نواہی سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے۔ اس لیے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہرحال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دارومدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چُونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کے استحکام کیلئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے، اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبّت و اُلفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصوّرات کے تحت دنیوی غلبہ و اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ ع "ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پُوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصّہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے!

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزّت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزّت و ذلّت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف 'تقویٰ' ہے اس لیے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوّا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر

رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن[1] بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعۃً انسانی عزت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا! لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رُخ لائق توجہ ہیں۔ ایک: یہ کہ اُوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی اُن کی جڑ میں جو گمراہی کارفرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور دوسرے: یہ کہ اسلام اِن میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہلِ ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیارِ عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ الٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اُجاگر کرنے کے لیے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" سے ہوا۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورۃ الحجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنّٰی سورۃ النساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اُس کا خارجی ظہور ہے، لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین

---

[1] چنانچہ ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) نے اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوت کے نہایت اُونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی) کا کارنامہ ہے۔

کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کر لے اسے "اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" ایک انگریزی مقولے[1] کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے، بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفیٔ کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے اس لیے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقْرَارٌ بِاللِّسَان" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہو گئی:۔

ایک[2] یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق، بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا، یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے (جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفورٌ اور رحیمٌ سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امّتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے[2] یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ہدایت آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لیے

---

[1] (CALL THE ROSE BY ANY NAME IT WILL SMELL AS SWEET)

[2] واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

جان و مال سے کوشش کرے اور اس جدّوجہد میں تن من دھن سب قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

سورۃ الحجرات کی اس آیہ کریمہ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ) پر گویا کہ ہمارے منتخب نصاب کا جزو ثانی ختم اور جزو ثالث شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ سورۃ العصر میں بیان شدہ چار لوازمِ نجات کو اس آیت میں دو اصطلاحات میں جمع کر دیا گیا ہے ایک ایمانِ حقیقی جو جامع ہے ایمانِ قولی اور عملِ صالح دونوں کا اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا چنانچہ یہیں سے تواصی بالحق کی تفصیلی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

بقیہ : حرفِ اوّل

کے فضل و کرم سے نہایت سرگرم اور فعال ہیں' اپنا ذاتی مکان اس کام کے لئے فراہم کر دیا ہے ـــــ گرلز کالج کو چلانے کے لئے ابتدائی طور پر جس صلاحیت کے حامل افرادِ کار کی ضرورت ہوتی ہے' اللہ نے اپنی رحمت سے ان کی فراہمی کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ فالحمدللّٰہ علٰی ذٰلک!

خیال یہ ہے کہ "مجوزہ گرلز ونگ" میں طالبات کے لئے چھٹی کلاس سے ایف اے تک تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ اس سال فرسٹ ایئر میں داخلہ اوپن کرنے کا پروگرام ہے۔ آئندہ سال سے اگر اللہ نے چاہا تو چھٹی ساتویں کی سطح پر تدریس کا اہتمام بھی کر دیا جائے گا۔ السّعی منّا والاتمام من اللّٰہ۔

عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ :

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ

"تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"

حقیقت ایمان

خلاصۂ مباحث

از قلم : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء وسید المرسلین وعلٰی آلہ واصحابہ واتباعہ باحسان الٰی یوم الدین اما بعد :

اللہ ربّ العالمین کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس ذاتِ کریم نے مجھ جیسے قاصر العلم اور فارغ العمل کو ایسے بنیادی اور اہم موضوع یعنی "حقیقت ایمان" کی ترتیب و تسوید میں کچھ حصہ ڈالنے کی توفیق بخشی۔ ہوا یوں کہ شعبان ۱۴۱۶ھ میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یہاں عمرے کی نیت سے سعودی عرب تشریف لائے۔ آپ نے خواہش ظاہر کی کہ "حقیقت ایمان" پر میرے پانچ خطبات ہیں' اگر کسی طرح یہ تیار ہو کر چھپ جائیں تو یہ مفید کام ہے۔ میں نے خدمت کی حامی بھرلی۔ چنانچہ اسی سال رمضان المبارک کے فوراً بعد میں نے کام شروع کر دیا اور ۱۱ ذی القعدہ کو پہلی قسط حکمت قرآن میں اشاعت کیلئے بھیج دی اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ غالباً چھ قسطوں کے بعد یک دم میرے دل و دماغ پر ایک حجاب سا آگیا اور میں نے کام بند کر دیا۔ دو تین مرتبہ برادرم عاکف سعید صاحب کی طرف سے یاد دہانی بھی کرائی گئی' لیکن میں آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ کو میں پاکستان گیا اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے شکایت بھی کی اور اصرار بھی کہ اب یہ کام تم ہی کو کرنا ہے۔ لہٰذا میں نے تین ماہ تک اللہ تعالیٰ سے کشف حجاب کی دعا مانگی۔ بالآخر محرم ۱۴۱۹ھ سے میں نے دوبارہ کام شروع کر دیا اور بفضل اللہ و رحمتہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ میں کام مکمل ہو گیا۔ اس دوران میں نے خود بھی محسوس کیا کہ مضامین زیادہ ہی وسعت اختیار کر گئے ہیں' لہٰذا ان کا اختصار بھی ہونا چاہئے اور پانچویں خطاب کے شروع میں محترم ڈاکٹر صاحب نے بھی کسی سامع کی خواہش کا

تذکرہ کیا کہ: "آخر میں مضامین کا جامع خلاصہ آجانا چاہئے"۔ چنانچہ اولاً اپنی خوشی اور ثانیاً ایک بھائی کی خواہش کے پیش نظر میں نے خلاصۂ مباحث پر مشتمل یہ اختصار تیار کیا ہے۔

میری بھرپور کوشش رہی ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کے مدعا کو اپنے آسان اور مختصر الفاظ میں بیان کردوں۔ اگر کہیں غلطی یا کوتاہی محسوس ہو تو اس کاتب السطور سے رابطہ کیا جائے۔ محترم ڈاکٹر صاحب اس اختصار کی جملہ ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اختصار کو پڑھتے ہوئے کہیں اشکال محسوس ہو یا بات پوری طرح سمجھ نہ آئے تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اصل کتاب "حقیقت ایمان" کو دیکھ لیا جائے' ان شاء اللہ اطمینان ہو جائے گا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا و التجا ہے کہ ہم سب کو حقیقت ایمان سمجھنے' اس کو دل میں بسانے' اس کے مطابق زندگی گزارنے اور اس کے جملہ تقاضے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز

محتاجِ دُعا و اصلاح
ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور
الدوادمی' سعودی عرب

۱۴۱۹/۶/۱۵ھ
بروز منگل

حقیقتِ ایمان۔ خلاصۂ مباحث

کئی سال سے ہماری ساری جدوجہد اور سعی و کوشش ان چار اہم عناوین پر مرتکز رہی ہے:

۱) فرائض دینی کا جامع تصور
۲) اقامتِ دین
۳) منہج انقلابِ اسلامی
۴) حقیقتِ ایمان

۱) فرائضِ دینی کا جامع تصور

ان میں سے اولین' جامع ترین اور ہر لحاظ سے بنیادی اور اساسی عنوان "فرائضِ دینی کا جامع تصور" ہے اور اسی جامع تصور کو بنیاد بنا کر مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔

مسخ شدہ اور بیمار طبیعتوں کا معاملہ علیحدہ ہے' عام طور پر انسان کے فکر اور اس کے کردار میں ایک لازمی تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر فرائض کے بارے میں ہمارا تصور صحیح ہوگا تو عمل و کردار بھی ٹھیک ہوگا۔ فرائض دینی کے سلسلے میں سب سے زیادہ تاکیدی عنصر فریضۂ اقامت دین ہے۔ اس صدی میں اقامت دین کا یہ تصور اچھی طرح واضح اور نکھر کر سامنے آیا ہے کہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے اور دین ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ یہ تصور کچھ عرصہ تک نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے ہم سے جو کچھ ہو پایا ہم نے کیا ہے۔

۲) اقامتِ دین

اقامتِ دین کا معنی ہے پوری انسانی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں میں دین کا غلبہ۔ اس میں سماجی و معاشرتی' معاشی و اقتصادی اور سیاسی' غرضیکہ زندگی کا ہر گوشہ شامل ہے۔ چنانچہ اس میں دستوری اور قانونی امور بھی شامل ہیں۔ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام اور اس کی دوسرے نظاموں کے مقابلے میں امتیازی خوبیوں کی پہچان و بیان روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہیں۔ چونکہ انسانی قافلے نے علم' سائنس اور سماجی ترقی میں خاصا سفر طے کرلیا ہے لہٰذا اب یہ بھی واضح کرنا ہوگا کہ فی زمانہ اس نظامِ زندگی کو کن خطوط پر چل کر نافذ کیا جائے گا۔ ملکی نظام جمہوری ہو یا سیکنڈے نیوین سوشلزم سے کام چلے گا؟ یا ان سب میں سے عمدہ باتیں لے کر ایک نیا نظامِ حکمرانی بنانا پڑے گا؟ جب تک کسی نظام کے بارے میں واضح شعور نہ ہو اُس کی خوبیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور نہ ہی اُس کی خرابیوں سے بچا جاسکتا ہے لہٰذا رائج الوقت نظاموں کا مطالعہ اور بصیرت بھی اشد ضروری ہے۔

۳) منہجِ انقلابِ اسلامی

موجودہ نظام کو کس طرح تبدیل کیا جائے؟ اس کا طریق کار کیا ہو؟ اس ضمن میں ہمیں اسوۂ محمدیؐ سے راہنمائی لینی ہوگی۔ تب معلوم ہوگا کہ :

انقلابِ نبویؐ کا طریق کار کیا تھا؟ رسول اللہ ﷺ کی جدّوجُہد کے مراحل کیا تھے؟ اور آج ہمارے لئے ہر ہر مرحلے میں اہم نکات کیا ہیں؟ ایک مرحلے سے اگلے

مرحلے میں داخل ہونے کے لئے کن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے؟

اگر یہ راستہ واضح اور روشن ہو یعنی اقامتِ دین کی جدّوجُہد نبویؐ منہاج کے مطابق ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ صلاحیتیں بلکہ زندگیاں ضائع کرنے کے سوا دنیا میں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ البتہ آخرت کا اجر نیت پر ہے۔

۴) حقیقتِ ایمان

حقیقتِ ایمان چوتھے نمبر پر ضرور ہے لیکن کسی معنی میں بھی کم اہم یا کمتر نہیں۔ اس صدی میں دنیا بھر میں اقامت دین کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں ان کی ناکامی کی اہم ترین وجہ ایمان کے بارے میں ایک غلط فہمی ہے کہ چونکہ ہم مسلمان ہیں لہٰذا ایمان پر محنت کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ شعوری اور فکری ایمان ہی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہے ورنہ موروثی ایمان ایک جامد عقیدہ ہوتا ہے، اس کا انفرادی یا اجتماعی کردار پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ لہٰذا شعوری ایمان پر محنت ہی ہماری دنیاوی کامیابی، کردار کی اصلاح اور آخرت کی نجات کی ضامن ہے۔

ایمان کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

شرعی اصطلاحات کی بنیاد

ہمارے دین کی اساس قرآن حکیم اور حدیث رسول ﷺ پر ہے اور یہ دونوں عربی زبان میں ہیں، لہٰذا دین کی اصطلاحات عربی زبان میں ہیں اور جب کوئی لفظ اصطلاح کی صورت اختیار کرلے تو پھر اصل حجت عربی لغت نہیں بلکہ دینی اصطلاح ہوتی ہے۔ مثلاً "صلوٰۃ" کا لغوی معنی اگرچہ آگ تاپنا یا اقدام الی الشیء ہے، لیکن شرعاً یہ مخصوص اعمال و اذکار (نماز) کا نام ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ دینی اصطلاحات میں اصل بنیاد لغوی معنی نہیں بلکہ شریعت کے مقرر کردہ معانی و مفاہیم ہیں۔

ایمان کا لغوی مفہوم

لفظ "ایمان" کا اصل مادہ "ا م ن" ہے جس کا معنی خود امن میں ہونا ہے اور باب افعال میں اس کا مصدر ہوگا "ایمان" یعنی دوسرے کو امن فراہم کرنا۔ لفظ "ایمان" کے

بعد جب "ب" یا "ل" کا صلہ آئے تو معنی ہو گا کسی کے دعوے یا خبر کی تصدیق کرنا۔ جب یہ "بِ" کے صلے کے ساتھ آئے تو معنی ہوتے ہیں وثوق اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کسی کے دعوے یا خبر کی تصدیق کرنا اور جب اس کا صلہ "لَ" آئے تو بالعموم سرسری تصدیق مراد ہوتی ہے۔ لفظ ایمان جب اصطلاحی معنوں میں استعمال ہو تو "ب" کے صلے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ ، ﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ ، ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ ﴾۔

اصطلاحی اور شرعی تعریف

علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں :

"الایمان لغةً : التصدیق' و شرعًا : تصدیق الرسول فیما جاء به عن ربه" (۱)

"ایمان کا لغوی معنی ہے تصدیق اور شرعی معنی ہے رسول کی تصدیق جو کچھ بھی وہ اپنے رب کی طرف سے لائے"۔

انبیاء و رُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام جو کچھ بھی لائے ہیں وہ دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے : ① ایمانیات جو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی و رسول حضرت محمد ﷺ تک ایک ہی رہے ہیں ② شریعت جو کہ احکام و مسائل پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ ہر زمانے میں حالات کے اعتبار سے بدلتی رہی ہے۔ ایمانیات اور احکام شریعت دونوں میں ہی نبی و رسول کی تصدیق ایمان میں شامل ہے لیکن لفظ ایمان عام طور پر شریعت پر نہیں بلکہ "ایمانیات" اور ان کی تفصیلات پر بولا جاتا ہے۔

ایمان کا موضوع

ہمارے علم کے دو دائرے ہیں ① طبیعیات ② ماوراء الطبیعیات

۱) **طبیعیات** : سے مراد وہ علم ہے جو ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کرتے ہیں' مثلاً دیکھ کر' سن کر' چھو کر' سونگھ کر' چکھ کر۔

۲) **مابعد الطبیعیات یا ماوراء الطبیعیات** : ان حقائق کا علم ہے جن کو ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعے نہیں پا سکتے۔ ان حقائق سے متعلق جو خیال حکماء اور فلاسفہ نے پیش

کیا ہے اس کا نام منطق اور فلسفہ ہے اور جو جواب انبیاء و رُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام نے پیش کیا ہے اس کا نام "ایمان" ہے۔ مابعد الطبیعیات کا علم جن حقائق سے بحث کرتا ہے ان کا تسلی بخش جواب کسی فلسفی یا منطقی کے پاس نہیں' صرف اور صرف انبیاء و رُسل علیہم السلام کے پاس ہے' اس لئے کہ ان کا علم ظن و تخمین یا قیاس پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ یقینی اور حقیقی ہوتا ہے' کیونکہ اس کا ذریعہ وحی ہوتا ہے۔

قابلِ توجّہ حقائق پر ایک نظر

پہلی حقیقت

انسان علم و عمل کے اعتبار سے دو قسم کے ہوتے ہیں ① تقلیدی ② تحقیقی۔

۱) تقلیدی : لوگوں کی ایک بڑی اکثریت تقلیدی مزاج کی ہوتی ہے۔ جو سب کر رہے ہوتے ہیں وہی یہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کو کیوں اور کیسے سے غرض نہیں ہوتی۔

۲) تحقیقی: کروڑوں میں سے کوئی ایک آدمی تحقیقی مزاج کا ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو دلیل سے جاننا چاہتا ہے' چاہے اس کی خاطر اس کی جان چلی جائے۔

دوسری حقیقت :

علم کی بھی دو اقسام ہیں ① علم الابدان ② علم الادیان۔

۱) علم الابدان : سے مراد وہ علم ہے جسے فزکس یا سائنسی علوم کہا جا سکتا ہے؟ اسی کو علم الاشیاء کہتے ہیں اور یہی علم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھایا تھا۔

۲) علم الادیان : یہ علم بنیادی اور اصولی قسم کے سوالات سے بحث کرتا ہے۔ انسان کے کردار کا اس علم سے گہرا تعلق ہے۔ متعلقہ سوالات عنقریب بیان ہوں گے۔

فلسفہ کی حقیقت

تقلیدی مزاج کے لوگوں کو تو اصولی سوالوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی' البتہ تحقیقی مزاج کے لوگ ایک ایک سوال کی خاطر سرگرداں رہتے ہیں۔ چنانچہ اہل منطق و فلسفہ نے ان اصولی سوالوں کا جواب پانے کے لئے عقل استعمال کی' منطق سے مدد لی اور

استخراجی اور استقرائی طریقے سے جواب تلاش کئے۔ بہرحال انہوں نے جو کچھ پایا اسے کتابوں میں مدون کردیا' لیکن بات خیال' گمان اور اندازے سے آگے نہ بڑھ سکی۔

بنیادی واصولی سوالات اور ان کا حل

سوال ① : کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

ج : یہ کائنات نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی بلکہ یہ ایک خاص وقت تک کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ (الروم : ۸' اور اسی معنی میں الاحقاف : ۳)

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدتِ مقرر ہی کے لئے پیدا کیا ہے"۔

گویا کہ یہ کائنات نہ ازل سے ہے اور نہ ابد تک رہے گی' البتہ اس کا خالق ومالک ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ بے عیب صفات سے متصف ہے' اس کی ساری صفاتِ حسنیٰ میں کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ مثل ومثال ہے۔ ساری کائنات کا وہ تنہا مالک ہے۔ مخلوق بھی اسی کی' حکم بھی اس کا۔ فرمایا: ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ باقی سب عاجز اور حکم کے پابند بندے ہیں' خواہ انسان ہوں' خواہ جن' فرشتے یا باقی مخلوقات۔

سوال ② : انسان کی حقیقت کیا ہے؟

ج : انسان کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے تخلیق کیا' زمین کی خلافت بخشی' فرشتوں سے سجدہ کروایا' ساری مخلوق پر فضیلت وفوقیت دی' اپنی طرف سے اس میں روح پھونکی اور کچھ عرصہ کے لئے اسے زمین پر بااختیار بنا کر بھیج دیا تاکہ اس کا امتحان لیا جاسکے کہ آیا یہ فرمانبردار خلیفہ کا کردار ادا کرتا ہے یا کہ باغی بن کر خود خدا بن بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (المُلك : ۲)

"اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے

کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

یہی دنیاوی زندگی ہمارا دارالامتحان ہے۔ اگلی منزل عالم برزخ ہے۔ اس کے بعد بعث و نشور کا مرحلہ آئے گا۔ آخر میں عمل کے اعتبار سے جنت یا دوزخ ہے اور یہ سارے مراحل ہمارے ایمان کا جزو ہیں۔

سوال ③ : انسان کیوں جوابدِہ ہے؟

ج : انسان جواب دہ اس لئے ہے کہ اسے : (۱) سمع و بصر کی صلاحیتیں عطا کی گئیں (۲) عقل و شعور سے نوازا گیا (۳) نیکی اور بدی کی پہچان اس کی فطرت میں رکھ دی گئی (۴) معرفت و محبّتِ رب ودیعت کی گئی۔ ان چار صلاحیتوں کی وجہ سے ہی انسان جواب دہ ہو سکتا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کے طور پر رسولوں کو مبعوث فرمایا' کتابیں نازل کیں اور حسب ضرورت معجزے اور نشانیاں ظاہر کیں تاکہ لوگ آسانی سے ہدایت کا راستہ معلوم کر سکیں اور اس پر عمل کر سکیں۔

سوال ④ : علم کی حقیقت کیا ہے؟

ج : حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کو علم الابدان کا نام دیا جا سکتا ہے۔ البتہ ماوراء الطبیعیات سے متعلق علم کو فلاسفہ نے یقین اور حجت کے ساتھ بیان نہیں کیا بلکہ اپنے اپنے اندازے' قیافے' خیالات اور ظن و گمان بیان کئے ہیں' البتہ وحی ایک ایسا ذریعہ ہے جو یقینی علم کی خبر دیتا ہے اور دعوے سے کہتا ہے کہ یہی حق ہے' اسکے علاوہ حق نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا ہے ﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ "یہ الکتاب ہے' اس میں ذرہ بھر شک نہیں"۔ اور یہی علم انسان کو معرفت و یقین عطا کرتا ہے جو عمل و کردار کی بنیاد بنتا ہے۔ بذریعہ وحی ملنے والے علم کی چار سطحیں ہیں۔

(۱) عام فہم : قرآن و حدیث کا عمومی علم اسی قبیل کا ہے کیونکہ دین عام لوگوں کی راہنمائی کے لئے آیا ہے۔ فرمایا ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ "عام لوگوں کے لئے ہدایت ہے"۔

(۲) متکلمانہ : یعنی ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کی عقل و منطق کے ذریعے سے تعلیم و تفہیم۔ اس ضمن میں اشاعرہ' معتزلہ اور ماتریدیہ نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق بات کی ہے' البتہ سلفی حضرات نے خالص نص قرآن و حدیث کو بنیاد بنایا ہے۔

(۳) فلسفیانہ : متکلمین کے بعد فلاسفہ کی باری آتی ہے۔ انہوں نے خالص فلسفے

کے ذریعے بنیادی حقائق کو پیش کیا ہے۔ ان میں کندی، ابنِ سینا، فارابی اور ابنِ رشد کا نام آتا ہے۔

(۴) صوفیانہ : صوفیائے دینی حقائق کو علم بالقلب یا جذباتی کیفیت کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ صوفیانہ سطح کہلائے گی۔

سوال ⑤ : خیر و شر کیا ہے؟ یہ ذاتی پسند و ناپسند کا نام ہے یا اس کی کوئی بنیاد بھی ہے؟

ج : اس موضوع پر سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ کی روشنی میں مکمل درس قرآن موجود ہے، جو "نیکی کی حقیقت" کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں دستیاب ہے۔

ایمانیاتِ ثلاثہ کا باہمی ربط

ایمانیات ثلاثہ میں ایک نسبت و تناسب موجود ہے، تفصیل یوں ہے :

ایمان باللہ : اصولی، نظری، علمی اور فکری اعتبار سے اصل ایمان صرف ایمان باللہ ہے، اسی لئے ایمان مجمل کے الفاظ ہیں : "آمنتُ باللّٰہ کما ھو باسمائہ و صفاتہ و قبلتُ جمیعَ احکامہ اقرارٌ باللسان و تصدیقٌ بالقلب" تو معلوم ہوا کہ ایمان مجمل نام ہے "ایمان باللہ" کا، اسی کی گہرائی کو معرفت کہتے ہیں۔

ایمان بالآخرۃ : یہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل و قسط کا عملی ظہور ہے، یعنی وہ عادل ہے اور انصاف کرے گا، ہر انسان کو اس کے عمل کے اعتبار سے بدلہ دے گا، اس صفت کا ظہور آخرت میں ہو گا۔

ایمان بالرسالت : یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کی توسیع ہے، اس نے ایک ہدایت فطرت میں رکھی ہے اور دوسری وحی کے ذریعے دی ہے کیونکہ وہ "ہادی" ہے۔

ایمان بالآخرہ کی اہمیت : اصل ایمان بلاشبہ ایمان باللہ ہی ہے، لیکن کردار سازی کے اعتبار سے اصل ایمان، ایمان بالآخرۃ ہے کیونکہ اگر آخرت اور اس میں پیش آنے والے مراحل پر ایمان نہ ہو گا تو اصلاحِ اعمال ممکن ہی نہیں اور بدکرداری از خود در آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

> "حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں، انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑا اجر

ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔" (بنی اسرائیل : ۹۔۱۰)

ایمان بالرّسالت کا خصوصی مقام : شرعی، فقہی اور قانونی اعتبار سے اصل ایمان "ایمان بالرسالت" ہے اور جو آدمی اس کو نہ مانے وہ خالص کافر ہے، چاہے بظاہر کتنے اچھے کردار کا مالک ہو۔ کیونکہ ایمان باللہ کی جملہ تفصیلات اور ایمان بالآخرہ سے متعلق سارے حقائق و واقعات ایمان بالرسالت کے بغیر معلوم نہیں کئے جاسکتے۔ اس لئے کہ کوئی انسان اپنی عقل و دانست کے ساتھ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پاسکتا ہے اور نہ ہی آخرت کے متعلق صحیح اور جامع تصور رکھ سکتا ہے۔

ایمان کے مراتب

قوت اور ضعف کے اعتبار سے ایمان کے بے شمار اور لاتعداد مراتب ہیں۔ کہاں ایک عام انسان کا ایمان اور کہاں صحابہؓ کا ایمان اور اس سے بھی آگے کہاں انبیاء و رُسل علیہم السلام کا ایمان؟ ان لاکھوں کروڑوں مراتب کا علم ہمیں مندرجہ ذیل حدیث سے ہوتا ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا :

"قیامت کے روز اہل ایمان میں کسی کا نور مدینہ منورہ سے لے کر شہر عدن تک صنعاء (یمن کا دارالخلافہ) سے بھی آگے تک روشنی کر رہا ہوگا اور کسی کا اس سے کم ہوگا حتیٰ کہ بعض اہل ایمان کا نور قدموں کی جگہ تک ہی روشنی کرے گا اور لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف درجات پر ہوں گے۔"

(مصنف عبدالرزاق والمستدرک للحاکم)

بہرحال جسے ٹارچ جتنا نور مل گیا وہ بھی خوش نصیب ہوگا، پل صراط سے تو گزر ہی جائے گا چاہے ٹھوکریں کھا کر گزرے۔

ایمان کے دو رُخ

ظاہری / قانونی / لسانی / دنیا میں معتبر بمقابلہ باطنی / حقیقی / قلبی / آخرت میں معتبر۔ ایمان کے دو اہم اجزاء ہیں : اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب۔ ظاہری / قانونی / لسانی / دنیا میں معتبر ایمان کا تعلق اقرار باللسان سے ہے اور دنیا کا سارا نظام اسی پر ہی چلے گا۔ دل میں کیا ہے؟ اس کا فیصلہ دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا، اس کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

باطنی / قلبی / حقیقی / آخرت میں معتبر ایمان کا تعلق تصدیق بالقلب سے ہے۔ آخرت کی نجات کا دارومدار اسی ایمان پر ہے اور یہی اصل مطلوب ہے۔

حقیقتِ ایمان سمجھنے میں چند اشکال اور وضاحت

احادیث رسول ﷺ کا سرسری مطالعہ کریں تو کئی اشکال سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف اس معنی کی احادیث موجود ہیں کہ صرف کلمۂ توحید سے انسان جنت میں داخل ہو جائے گا' دوسری طرف ایسی احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ تو دور کی بات ہے محض کج خلقی سے یا پڑوسی کو تکلیف دینے سے انسان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ آخر حقیقت کیا ہے؟

وضاحت : اس قسم کے اشکالات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل سوالات کا جواب حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۱) آیا ایمان صرف اقرار و تصدیق کا نام ہے یا عمل صالح بھی ضروری ہے؟

(۲) عمل صالح ایمان کا جزو لازم ہے یا اضافی چیز ہے؟

(۳) کبائر سے ایمان ختم ہو جاتا ہے؟ یا وقتی طور پر اٹھ جاتا ہے؟ یا علیٰ حالہ باقی رہتا ہے؟

(۴) کیا ایمان اعمال صالحہ سے بڑھتا ہے؟ اور گناہوں سے کم ہوتا ہے؟ یا اس کی کمیت و کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟

عقائد اور ایمانیات کی روشنی میں جب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل گروہ نظر آتے ہیں' جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں عقائد کو پیش کیا ہے۔

۱۔ خوارج : ان کے نزدیک عمل صالح ایمان کا جزو لازم ہے' اگر جزو ساقط ہو جائے تو کل بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی سے فرض عمل رہ گیا یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہو گیا تو وہ دائرہ اسلام سے نکل کر دائرہ کفر میں داخل ہو گیا۔ عہد صحابہؓ سے لے کر آج تک اہل سنت والجماعت کے نزدیک خوارج اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

۲۔ معتزلہ : خوارج اور معتزلہ کا مسلک ایک ہے' بس خوارج کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر کہتے ہیں جبکہ معتزلہ کے نزدیک وہ اسلام سے نکل گیا البتہ کفر میں داخل نہیں ہوا۔

اس طرح اس پر کافروں والے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔

۳ - محدثین : امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل' امام بخاری اور دیگر محدثین رحمہم اللہ کا عقیدہ ہے کہ ایمان نام ہے : قول' تصدیق اور عمل کا۔ جو نیکی سے بڑھتا اور گناہوں سے کم ہوتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بھی عمل ایمان کا لازمی جزو ہے لیکن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان نہ ایمان و اسلام سے نکلتا ہے اور نہ ہی کفر میں داخل ہوتا ہے۔ البتہ گناہ کی کمیت و کیفیت کی نسبت سے ایمان کم ہو جاتا ہے۔

۴ - فقہاءِ احناف : امام ابو حنیفہ' ان کے شاگردوں اور متبعین کے نزدیک ایمان نام ہے تصدیق و اقرار کا۔ عمل علیحدہ شے ہے' لہٰذا عمل کی کمی یا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا تارکِ فرائض یا گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر نہیں کہا جائے گا البتہ گناہوں پر آخرت میں سزا ضرور ملے گی۔

۵ - مُرجئہ : ان کے نزدیک ایمان نام ہے اعتقاد و اقرار کا' عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ چاہے انسان عمل کرے یا نہ کرے اور چاہے عمر بھر کبیرہ گناہ کرتا رہے وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ اور جہنم صرف کافروں کے لئے ہے' اہل ایمان سیدھے جنت میں جائیں گے۔

۶ - کرامیہ : ان کے نزدیک محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دینے والا مکمل مومن ہے۔ دل میں تصدیق ہے یا نہیں' عمل ہے یا نہیں' کبیرہ گناہ ہیں یا نہیں' ان چیزوں کا کوئی دخل نہیں۔ بس لا الٰہ الا اللہ کہہ دینے سے جنت پکی ہو جاتی ہے۔

۷ - اہل تشیع : اہل تشیع اور معتزلہ کا عقیدہ ایک ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان اسلام سے باہر ہو جاتا ہے البتہ کفر میں داخل نہیں ہوتا۔ اضافی کام انہوں نے یہ کیا ہے کہ دنیا میں لوگوں کو اسلام سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ اہل بیت اور چند صحابہؓ کو چھوڑ کر بالعموم صحابہ رضی اللہ عنہم کو انہوں نے کافر یا منافق کہنا شروع کر دیا۔

محدثین اور فقہاءِ احناف کا مسلک "مسلک اہل سنّت و الجماعت" سے موسوم ہے۔ یہی دونوں مسلک اقرب الی الحق والصواب سمجھے جا سکتے ہیں۔

سوالات کا آسان جواب

قانونی ایمان : ظاہری / قانونی / لسانی / دنیا میں معتبر ایمان کا دارومدار قول پر ہے۔ اس درجے میں اعمال ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ تصدیق کو تو ہم جان ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا ابو بکر صدیق اور عبداللہ بن ابی بن سلول قانون کی نگاہ میں برابر کے مسلمان ہیں۔

حقیقی ایمان : باطنی / حقیقی / قلبی / آخرت میں معتبر ایمان اصل میں قلبی ایمان ہے۔ آخرت میں حساب کتاب اور فیصلوں کا دارومدار اسی حقیقی ایمان پر ہے۔ آخرت میں ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ جنت الفردوس میں ہوں گے تو عبداللہ بن ابی بن سلول جہنم کی آخری اور نچلی سطح پر ہوگا۔ اس درجے میں آکر اعمال صالحہ ایمان کا جزو بن جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دل میں پختہ یقین ہو اور اس کے بعد عمل نہ ہو؟ اس موضوع کو مزید دلائل سے سمجھنے کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا کتابچہ "راہ نجات : سورۃ العصر کی روشنی میں" ضرور پڑھیں۔

اسلام کیا ہے؟ : ارکانِ اسلام پر عمل کا نام "اسلام" ہے۔ حدیث جبریل میں آیا ہے : "اسلام یہ ہے کہ تم لا اِلٰہ اِلاّ اللہ محمدٌ رسول اللہ کی شہادت دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو"۔ معلوم ہوا ظاہری اعمال اور ظاہری اطاعت کا نام "اسلام" ہے۔

ایمان کیا ہے؟ : ایمان دلی یقین کا نام ہے۔ حدیث جبریل کا اگلا حصہ ہے : "(ایمان یہ ہے) کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور یہ کہ تم ایمان لاؤ اچھی بری تقدیر پر"۔

احسان کیا ہے؟ : ایمان کی بدولت پیدا ہونے والے اعمال میں گہرائی اور گیرائی کا نام احسان ہے۔ حدیثِ جبریل کے تیسرے حصے میں فرمایا گیا : "کہ تم اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا کہ تم بچشم خود اسے دیکھ رہے ہو، اگر خود دیکھنے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو (دوسرے درجے میں یہ کیفیت ضرور پیدا ہو کہ) اللہ تم کو دیکھ رہا ہے"۔ [۲]

تو معلوم ہوا کہ ظاہری اور قانونی ایمان، جس کا دوسرا نام اسلام ہے، کے لئے واجبات کا التزام یا کبائر سے اجتناب کوئی لازمی جزو یا شرط نہیں ہے اور دنیا میں احکام کا

اجراء اسی اسلام کی بنیاد پر ہوتا ہے' البتہ حقیقی ایمان کے لئے عمل صالح کا التزام اور کبائر سے اجتناب لازمی جزو ہے اور آخرت کی نجات اسی حقیقی ایمان کی بنیاد پر ہوگی۔ اور حقیقی ایمان کی وجہ سے اعمال میں جو گہرائی اور گیرائی آتی ہے اس کا نام احسان ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مخصوص حالات میں بظاہر اسلام موجود ہو اور ایمان ابھی دل تک نہ پہنچا ہو' سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں فرمایا :

"یہ بدوی کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ اے نبیؐ! ان سے کہہ دیں کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ البتہ اگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا' بے شک اللہ غفورٌ رحیم ہے"۔

ایمان و عمل کا باہمی تعلق

ایمان اور عمل کے تعلق کو محدثین اور فقہاء احناف [۳] نے اپنے اپنے انداز میں لیا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم میں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تذکرہ کثرت سے آیا ہے' تاہم ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ میں "واوٗ" محل اختلاف ہے کہ آیا یہ واوٗ تفسیریہ ہے یا عاطفہ ہے؟ محدثین نے واوٗ تفسیریہ مانا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایمان کی تعریف کی ہے کہ : ایمان' تصدیق' اقرار اور عمل کا نام ہے۔ اس طرح عمل ایمان کا جزو لازم بن گیا جبکہ فقہاء احناف نے واوٗ کو عاطفہ کہا ہے۔ گویا ایمان ایک حقیقت ہے اور عمل صالح دوسری حقیقت' لہٰذا عمل ایمان کا جزو لازم نہیں ہے۔ انہوں نے ایمان کی تعریف کی ہے کہ : "ایمان تصدیق و اقرار کا نام ہے"۔

ہمارے معاشرے میں بے عملی کا ایک بڑا سبب

بے عملی اور بد عملی کے اسباب میں جہاں شیطانی وساوس اور انسانی نفوس کی شرارتوں کا بڑا دخل ہے وہاں ہمارے معاشرے میں اس کے فروغ کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ فقہاءِ احناف نے یہ تو بتا دیا کہ "عمل" ایمان کے اجزاء میں شامل نہیں ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ تعریف کیوں اختیار کی گئی؟ اس کے قانونی اسباب یا تقاضے

کیا تھے؟ اور پھر عوام کو بد عملی و بے عملی سے نجات دلانے والے عوامل کیا ہیں؟ دوسرا ظلم یہ کیا کہ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں بھی بے عملی یا بد عملی پر وعید آئی اس کا ترجمہ اس انداز سے کیا کہ سارا اثر ہی خود بخود ختم ہو گیا اور پڑھنے والا بے خوف ہو کر گناہ میں اور "ترقی" کرتا چلا گیا۔ سب نے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے کہ : "جس نے لا اِلٰہ اِلاّ اللہ کہہ دیا جنت میں چلا گیا"۔ اور اس کے بعد غلط نظریۂ شفاعت نے ساری کسر نکال دی ہے۔ نہ فرائض کی پرواہ نہ کبیرہ گناہوں سے ڈر' بس ایک ہی جملہ زبانوں پر چڑھا ہوا ہے : "کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں" لہٰذا کسی عمل کی کیا ضرورت؟

مذکورہ بیماریوں کا علاج : علماء کرام کا فرض ہے کہ امت کو بتلائیں کہ عمل چاہے قانونی ایمان کا جزو نہ سہی لیکن آخرت کی نجات عمل پر منحصر ہے' نیز جہاں قرآن و حدیث میں وعید و تنبیہ پر مشتمل نصوص آتی ہیں ان کا ترجمہ بغیر کسی ذہنی تحفظ کے کر دیا جائے تاکہ اس کی تاثیر باقی رہے اور یہ بات بھی عوام تک پہنچا دی جائے کہ شفاعت برحق ہے لیکن شفاعت کا حقدار بننے کے لئے کم سے کم فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب ضروری ہے' ورنہ شفاعت تو دور کی بات ہے ہم قیامت کے روز آنحضور ﷺ کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اور اگر ہمارے کرتوت دیکھ کر آپ ﷺ نے فرما دیا کہ انہیں دور کرو میں انہیں نہیں جانتا تو بتائیں کہاں مُنہ چھپائیں گے؟

کبائر کے مرتکب کا ایمان؟

ایک آدمی کبیرہ گناہ کرتا ہے اس کے ایمان کا کیا حکم ہے؟ ایمان کے ظاہری و قانونی پہلو (اسلام) کو سامنے رکھیں اور ایمان کے حقیقی اور باطنی پہلو کو بھی سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب اسلام سے تو خارج نہیں ہوا گویا کہ کافر نہیں ہوا البتہ حقیقی اور باطنی ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ (۴) لیکن ہم اس پر "بے ایمان" کا فتویٰ نہیں لگا سکتے کیونکہ قلبی ایمان کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ایمان کا حال؟

موجودہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت وراثتی مسلمانوں کی ہے۔ گویا کہ شعوری ایمان سے تو محروم ہیں' ویسے کلمہ گو مسلمان ہیں۔ اسی طرح کی کیفیت ان مسلمانوں کی تھی جو

آپؐ کی زندگی میں مختلف وجوہات کی بنا پر مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (آیت کا ترجمہ ابھی گزرا ہے)۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل تین نکات پر غور کرلیں۔

۱۔ مثبت ایمان اور اس میں درجات کا اضافہ اور بالآخر لامحدود ایمان کا مقام، جیسے ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان۔

۲۔ منفی ایمان یعنی نفاق اور اس میں پستیوں کا اضافہ اور بالآخر لامحدود پستی، جیسے عبداللہ بن ابی بن سلول کا نفاق اور منافقانہ کردار۔

۳۔ ان دو متضاد انتہاؤں کے درمیان لازماً مقام صفر آئے گا، یعنی نہ مثبت ایمان اور نہ منفی نفاق، بلکہ زیرو لیول۔ ہماری عظیم اکثریت اسی مقام پر کھڑی ہے۔

قانون تو یہ ہونا چاہئے کہ مثبت ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے رعایت برتی اور فرمایا: "اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے عمل میں کوئی کمی نہیں کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

(الحجرات : ۱۴)

ایمان میں کمی بیشی یا جمود

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے علاوہ ائمہ ثلاثہ اور تمام محدثین کا قول ہے: "الایمان قول و عمل یزید بالطاعۃ و ینقص بالمعصیۃ" یعنی "ایمان قول و عمل کا نام ہے جو کہ اطاعت کے کاموں سے بڑھتا اور گناہوں سے کم ہوتا ہے"۔

اس موقف کے دلائل دیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران آیت ۱۷۳، سورۃ الانفال آیت ۲، سورۃ الاحزاب آیت ۲۲، سورۃ التوبہ آیت ۱۲۴/۱۲۵، نیز مسند احمد ۲/۲۹۷، سنن الترمذی تفسیر سورۃ المطففین اور المستدرک الحاکم ۲/۵۱۷ اور یہ ظاہر و مشہود بات بھی ہے کہ نیک اعمال سے، اہل اللہ کی محفل میں بیٹھے رہنے سے، رزق حلال کھانے سے دل میں ایمان کا نور محسوس ہوتا ہے اور اس کے برعکس بدکاریوں سے، برے لوگوں کی محفل میں بیٹھنے سے اور رزق حرام کھانے سے دل میں ظلمت و تاریکی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا محدثین کی رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

دینِ ابراہیمؑ اور ریاستِ اسرائیل
قرآن مجید کی روشنی میں

تالیف : عمران این حسین
اُردو ترجمہ : سید افتخار احمد

نیویارک کی مسجد دار القرآن کے امام جناب عمران این حسین کی انگریزی تصنیف
The Religion of Abraham and the State of Israel — A View from the Quran
کا اُردو ترجمہ بالاقساط ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پیشِ نظر شمارے میں کتاب کے "تعارف" کا اُردو ترجمہ شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ باب اول سے کتاب کا باقاعدہ آغاز آئندہ شمارے سے کیا جائے گا (ان شاء اللہ)

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑی خوبی اور استدلال کے ساتھ وضاحت کی ہے کہ کس طرح یہود نے تورات میں تحریف کے ذریعے میثاقِ ابراہیمیؑ سے حضرت اسماعیلؑ اور اُن کی نسل کو خارج کر دیا۔ نیز قرآن مجید کی روشنی میں عالم اسلام کے لئے ریاست اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارے میں زبردست تنبیہ کی ہے۔ مصنف کے بقول مسلمان افراد یا اسلامی حکومتیں، جو ریاست اسرائیل کو تسلیم کریں گے، وہ ازروئے قرآن منافق شمار ہوں گے۔ (ادارہ)

تعارف

(ا) تسلیم کرنے میں تذبذب

اسرائیل کی یہودی ریاست کو تسلیم کیا جائے یا نہ تسلیم کیا جائے، آج کی مسلمان حکومتوں کو یہ مسئلہ درپیش ہے۔ اُن کے تذبذب کا باعث یہ ہے کہ غیر یہودی دنیا کی طرف سے یہودی ریاست کے عالمی سطح پر تسلیم کئے جانے اور پھر اس کی حفاظت اور قائم رہنے میں آج جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ اسلام اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ماننے

والے ہیں۔ تھی دست مسلمان مستقل طور پر ریاست اسرائیل کو تسلیم کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اور اسلام وہ خاص قوت ہے جو دوبارہ عالمی سٹیج پر اُبھر رہی ہے۔ اس کے برعکس دُنیا میں "مسلمانوں" کا ایک شکاری گروہ اپنے مفادات کے لئے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی کوشش میں ہے اور اسے انہوں نے "طریق امن" کا نام دیا ہے۔ مصر، پاکستان، ملائشیا وغیرہ کے یہ "مسلمان" لٹیرے جو حکومت کرنے اور مراعات حاصل کرنے کے عادی ہیں، انقلابِ اسلام کے غلبہ سے خوف زدہ ہیں۔ ان کے لئے بڑا خوف وہ سلوک ہے جو ایران کے اسلامی انقلابیوں نے اپنے ملک کے لٹیروں سے کیا۔ چنانچہ اسرائیل کو تسلیم کرنے پر زیادہ زور انہی خوف زدہ "مسلمان" لٹیروں کی طرف سے ہے، کیونکہ انہیں استحصال زدہ مسلمانوں اور اسلام کے ٹھوس اور غیر مصالحانہ انصاف سے اپنی تباہی کا خوف دامن گیر ہے۔ یہ نوشتۂ دیوار تقریباً دس ارب مسلمانوں پر حکومت کرنے والے ان لٹیروں کے لئے ہے جو ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی انتھک کوشش بھی یہی لوگ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لئے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے بھی زور دیا جا رہا ہے، اور مغرب کی پیدا کردہ اُن عالمی تنظیموں کی طرف سے بھی جو ان کی خدمت کر رہی ہیں، مثلاً اقوام متحدہ، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف وغیرہ۔ اس ضمن میں یہودی استعمار کا اِن حکومتوں کی خارجہ پالیسی اور ان تنظیموں کی قوتِ فیصلہ پر بڑھتا ہوا اثر و رسوخ، اسرائیل اور مغربی سرمایہ داری اور جمہوریت پر مبنی نظام کو اسلام سے لاحق مستقل خطرہ، اور اس لادینی نمونۂ حیات کو اسلام سے لاحق خطرہ، جو ان سب کو برقرار رکھے ہوئے ہے ـــــ یہ تمام عوامل اس دباؤ کے پس پشت کارفرما ہیں جو آج مسلمانوں کو درپیش ہے۔

مسلمان حکومتوں کی قوتِ برداشت اس دباؤ کے مقابلہ میں دن بدن کمزور ہو رہی ہے، جس کی وجہ سیاسی و عسکری کمزوری اور معیشت پر سودی [1] شکنجہ کی سختی میں اضافہ ہے۔ دراصل "نئے عالمی نظام" میں غلبے کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے اس کی بنیاد عسکری دباؤ اور معاشی استعمار ہے۔ اسرائیل کی یہودی ریاست کی بقا اور استحکام میں یہ کھیل سب سے زیادہ زور اور استقامت کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔ چونکہ مغربی دُنیا میں ذرائع ابلاغ

اس حقیقت کو ظاہر نہیں ہونے دے رہے لہٰذا امریکہ میں بے شمار عیسائی اور یہودی اس سے ناواقف ہیں۔

ترکی، مصر، اردن اور پی ایل او (P.L.O) نے اسرائیل کو تسلیم کرلیا ہے۔ سعودی عرب اسرائیل کا سب سے بڑا ہدف ہے، کیونکہ یہ اسلام کا مرکز ہے جس میں حرمین کی سرزمین (مکہ اور مدینہ کے متبرک مقامات)، حج (مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا خانہ کعبہ) اور مسجد نبوی ﷺ واقع ہیں۔ جب تک سعودی عرب اسرائیلی ریاست کو تسلیم نہ کرلے اس یہودی ریاست کو تسلیم کئے جانے کی تمام کوششیں بار آور نہیں ہونگی۔ لیکن جونہی سعودی عرب اس یہودی ریاست کو تسلیم کرتا ہے دُنیا اُن قوتوں کے مظاہرہ کا مشاہدہ کرلے گی جو یہودی ریاست اور صیہونیت کی بقا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں [۲] سعودی عرب میں اندرونی خلفشار کے شروع ہونے کا ثبوت ۱۹۹۵ء کا ریاض میں امریکی فوجی ٹریننگ سینٹر پر بم دھماکہ ہے جس سے چھ اموات اور ساٹھ سے زائد لوگ زخمی ہوئے۔ پھر جون ۱۹۹۶ء میں دوسرا بڑا بم دھماکہ ہے جس میں اٹھارہ امریکی سپاہی مارے گئے اور ۴۰۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ ان بم دھماکوں سے دُنیا کو سعودی عرب کے اندرونی خلفشار کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس اختلاف کی ایک بنیادی وجہ سعودی عرب کا ایک اسلام دشمن مغربی طاقت کے ساتھ حاشیہ نشینی کا تعلق ہے۔ اسرائیل کو تسلیم کیا جانا سعودی حکومت کے اندرونی خلفشار کو بڑھانے کا باعث ہوگی۔

اسرائیل کے الیکشن ۱۹۹۶ء میں لکڈ پارٹی کی کامیابی اور بنجمن نتن یاہو کی بطورِ اسرائیلی وزیراعظم تقرری، اسرائیل کی قدیم یہودی ریاست (جو حضرت داؤد علیہ السلام نے قائم کی تھی) کے دوبارہ قیام کے لئے نقیب بن کر سامنے آئی ہے۔ ہمارا دور اس قیام کی تجدید کا آخری مرحلہ ثابت ہوگا۔ یعنی وہ صورتحال جس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر جدید ہوگی، جس کے لئے مسجد اقصیٰ کو مسمار کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ مسجد کا مسمار کیا جانا سعودی حکومت کے لئے بہت سے خطرناک مسائل کھڑے کردے گا۔ نتیجتاً سعودی حکومت حج بند کردے گی اور یہ حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت ہوگا جس میں آپؐ نے یاجوج ماجوج کے آزاد ہونے اور حج کے بند ہونے کے متعلق فرمایا تھا:

> ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "لوگ یاجوج ماجوج کی آزادی کے بعد بھی کعبہ کا حج اور عمرہ ادا کرتے رہیں گے"۔

شعبہ ﷺ نے مزید روایت کیا کہ :

"قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ کعبہ کا حج بند ہو جائے" (رواہ البخاری)

سعودی حکومت حسب معمول "انتظار" کا کھیل کھیل رہی ہے اور اپنے آپ کو ممکن حد تک اسرائیل کو تسلیم کرنے کے خطرات سے بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ دوسری مسلم حکومتوں بالخصوص پاکستان اور ملائشیا پر مزید دباؤ ڈال رہی ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کریں۔ سعودیوں کے خیال کے مطابق پاکستان اور ملائشیا غیر عرب اسلامی دنیا میں اہم ترین ہیں۔ اور ان کے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرنے پر غیر عرب اسلامی دنیا میں رائے عامہ پر مطلوبہ اثر پڑے گا۔ مصر' اردن اور ترکی کے ساتھ ساتھ پاکستان اور ملائشیا کے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرنے کے بعد سعودی حکومت کے لئے اسے تسلیم کرنا ایران یا سوڈان کی طرف سے چنداں خطرے کا باعث نہیں ہو گا۔

لیکن سعودی عرب کے پاس اسرائیل کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ یہ پہلے ہی امریکہ کی حاشیہ بردار ریاست ہے اور اسے اپنی بادشاہت قائم رکھنے کے لئے امریکہ پر انحصار کرنا ہے۔[۳] شاہ فیصل مرحوم نے حاشیہ برداری کے کردار میں مضمر خطرہ کو بھانپ لیا تھا اور انہوں نے سعودی عرب کو اس سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی اس پالیسی نے اسرائیل کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ انہیں فریب سے قتل کر دیا گیا اور تیل کے ذخیرہ پر شکنجہ سخت کر دیا گیا۔ اگر سعودی عرب کی اس حاشیہ برداری کو چھپانے کی کوئی کوشش تھی بھی تو وہ ۱۹۹۰ء کی خلیجی جنگ نے صاف ظاہر کر دی اور اب شکنجہ پہلے سے بھی زیادہ جکڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ جلد یا بدیر سعودی عرب کو امریکی دباؤ کے تحت یہودی اسرائیل کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے۔ اب صرف وقت کی بات ہے کہ یہ حقیقت کب آشکارا ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب وحی الٰہی کی بنیاد پر ان خطرات کو منکشف کرنے کی کوشش ہے جو اسلامی دنیا کی مغرب پرست حکومتوں کو ریاست اسرائیل کے تسلیم کرنے کے دباؤ کی صورت میں درپیش ہے۔ اس میں درج معلومات ان حکومتوں کے لئے وارننگ ہے جنہوں نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے اور جو تسلیم کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں (بالخصوص پاکستان اور ملائشیا)' یہ کتاب ان بے شمار خطرات کے متعلق متنبہ کرتی ہے جو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارے میں دوررخی شاطرانہ سیاسی پالیسی میں مضمر ہیں اور جو واضح طور پر

ریاست اسرائیل کے قیام کو تورات کے مسخ ہونے کا منطقی نتیجہ ثابت کرتے ہیں۔ اسرائیلی ریاست جھوٹ اور فریب پر قائم ہوئی ہے اور قرآن مجید کا اعلان ہے کہ سچائی جھوٹ پر غالب آکر رہے گی۔ جو لوگ فریب کاری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ لازماً اپنے آپ کو اس میں تباہ کر لیتے ہیں، مگر وہ اس تباہی کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے اپنے فریب نے ان کو دھوکے میں رکھا ہوا ہے اور یہی ان کے انجام کا سبب بنتا ہے۔

"وہ اللہ اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ دھوکہ نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو، اور اس کا شعور نہیں رکھتے"۔ (البقرہ ۹:۲)

اس جھوٹ اور فریب کو سمجھنا لازم ہے جو اسرائیل کی ریاست کے قیام اور اس کی بقاء سے متعلق ہے۔ نیز اس کے لئے مذہبی تاریخ بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسرائیل کے بارے میں تقدیر کے خدائی فیصلہ کی پیشگی سمجھ ضروری ہے۔ لہٰذا ہم نے اس کتاب کا موضوع "دینِ ابراہیمؑ اور ریاست اسرائیل، قرآنی نقطۂ نظر سے" منتخب کیا ہے۔

ب) اسرائیل کے قانونی جواز کا بنیادی مطالبہ

اسرائیل کی یہودی ریاست کو تسلیم کرنے کا عمل درحقیقت اسرائیل کے قانونی جواز کو تسلیم کرنا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ریاست کو تسلیم بھی کریں اور یہ بھی کہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ ریاست اسرائیل کے قانونی جواز کو تسلیم کرنے اور دُنیا کی کسی دوسری ریاست کے جواز کو تسلیم کرنے میں بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ :

۱) اسرائیلی ریاست کے تسلیم کرنے میں یہودیوں کے اس بنیادی مطالبہ کو تسلیم کرنا آپ سے آپ شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ متبرک سرزمین (یعنی فلسطین) ہمیشہ کے لئے فقط ان کو دی ہے۔ بلکہ آج تک یہ سرزمین ان ہی کی ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہے۔ یہی ان کا مطالبہ ہے جس کی بنیاد تورات پر ہے۔

۲) فلسطین کی سرزمین تورات اور قرآن میں متبرک کہی گئی ہے۔ یہودیوں کا یہ نظریہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ فرمایا تھا اور یہ میثاق ابھی تک قابل عمل ہے، اور یہ کہ اللہ کے ساتھ خاص تعلقات کی بناء پر انہیں قانوناً اس سرزمین کے حصول کا حق ہے، اور اس پر عملاً قبضہ کرنے میں کامیابی ان کے مذہب اور ان کے مطالبہ کو جائز اور برحق ثابت کرنا ہے۔ اسرائیلی

ریاست کو تسلیم کرنے کا مطلب اس متبرک سرزمین پر قبضہ کے یہودی حق کو تسلیم کرنا ہے اور اس طرح یہودیت کی سچائی کا دعویٰ درست قرار دینا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن مجید میں یہود کے ان دعاوی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان دعاوی کو تسلیم کرنا شرک ہے۔ (۴) بہت سے مسلمان شرک کے اس عمل سے دیانت داری کے ساتھ بچے ہوئے ہیں۔ اسلامی دُنیا کے بے شمار مسلمان اسرائیل کو جائز ریاست تسلیم نہیں کرتے۔ دراصل سابق اسرائیلی وزیر اعظم رابن کے P.L.O کے چیئرمین یاسر عرفات کے ساتھ ناچار مصافحہ (جس سے خطہ میں امن کی توقع کی گئی) کا مطلب یہ تھا کہ اسلام سے اسے اور سیکولر فلسطینی قوم پرستی دونوں کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ اگر فلسطین میں اسلامی جدوجہد نہ ہوتی تو رابن عرفات مصافحہ کبھی نہ ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی طرح یہ اسلامی جدوجہد ختم کی جاسکتی تو اسرائیل کی P.L.O کے ساتھ مفاہمت تحصیل حاصل ثابت ہو جاتی۔

یہودیوں کے اس متبرک سرزمین پر خدائی حق کے دعویٰ نے یہودیوں اور "قیامِ امن" کے لئے خوفناک صورتحال پیدا کردی ہے۔ کیونکہ تورات کا یہ اعلان کہ:

"جہاں جہاں تمہارے پاؤں کا تلوا ٹکے وہ جگہ تمہاری ہو جائے گی"۔ (استثنا ۱۱: ۲۴)

قیامِ امن کے لئے اس سرزمین کی سودے بازی اس خدائی حق کے دعویٰ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ درحقیقت یہ موجودہ تورات سے غداری کے مترادف ہے اور اتنی قابل ملامت کہ اس سے بڑے پیمانے پر قتل وغارت ہو سکتی تھی۔ ایک بنیاد پرست یہودی کے ہاتھوں وزیر اعظم رابن کا قتل تورات سے اسی غداری کا شاخسانہ ہے۔ پھر بھی قیام امن کے لئے اس زمین کی سودے بازی دراصل اس بپھری ہوئی اسرائیلی قوم کی اسلام کے ساتھ فیصلہ کن تصادم سے بچنے کی آخری ممکن کوشش ہے۔

الغرض، اسرائیل کی یہودی ریاست کے جواز کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کنعان (موجودہ فلسطین اور اس کے ملحقہ علاقے) کی متبرک سرزمین بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لئے عطا کی تھی۔ یہودیوں کا یقین ہے کہ یہ متبرک سرزمین اس جدید دور میں بھی ان کی ہے، وہی اس کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں، چنانچہ عرب مسلمانوں کو، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، اور جنہوں نے یہودی ریاست کی

پوری تاریخ میں دوبارہ اسرائیل کی ریاست کے قائم ہونے تک ۱۴۰۰ سال اس سرزمین پر اپنا قبضہ اور کنٹرول قائم رکھا' اس پر کوئی حق حاصل نہیں تھا' بلکہ اس کے کسی حصہ پر یہودیوں کے ساتھ شراکت کا حق بھی نہیں تھا۔ یہودیوں کے اس بنیادی عقیدہ کی وجہ ان کا یہ خیال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے پہلے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام اس عہد یا میثاق میں شامل نہیں تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے وعدہ فرمایا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وعدہ خالصتاً ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسحاق علیہ السلام اور ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام (اسرائیل) اور ان کی اولاد (بنی اسرائیل) کے لئے ہی تھا۔ یہ بنی اسرائیل ہی تھے جو مصر میں رہتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے ان کو نجات دلائی تھی۔ یہی بنی اسرائیل ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں کی آخری بڑی تقسیم پیش آئی تھی۔ کچھ اسرائیلیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کے طور پر مانا اور کچھ نے انکار کر دیا۔ (القرآن ۶۱: ۱۴) عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے والے آج یہودی کہلاتے ہیں' اور یہی لوگ فلسطین کی متبرک سرزمین کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ گردانتے ہیں۔ کچھ عیسائی بھی ان کے اس مطالبہ کی حمایت اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ تورات ان کی بائبل کا ایک حصہ ہے۔

ج) جواز کی تسلیم و توثیق

ہم نے واضح کیا ہے کہ دراصل اسرائیل کی یہودی ریاست کی تسلیم و توثیق ہی اسرائیل کے حق کو جائز قرار دینا ہے۔ کوئی ملک بھی اسرائیل کی ریاست کو قبول کرتے ہوئے اس کے اس حق کو ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ یہ عالمی قانون کی رو سے ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن اسرائیلی ریاست کو جائز قرار دینا بنیادی طور پر دُنیا کی کسی اور ریاست کو جائز قرار دینے سے بہت مختلف ہے کیونکہ اسرائیل کی صورت میں اس کا تسلیم کرنا اس دعویٰ کو بھی تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ یہ متبرک سرزمین اللہ تعالیٰ نے خالصتاً بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لئے عطا کر دی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم ان کے اس دعویٰ کو تسلیم کر رہے ہیں کہ فلسطین کی متبرک سرزمین پر آج کے یہودیوں کو بھی خدائی حق حاصل ہے۔ "تسلیم" کرنے کا اس سے بھی زیادہ خطرناک مطلب یہ ہے کہ اسرائیل کی ریاست کو جائز تسلیم کرنا فلسطین پر یہودیت کا حق مان لینا ہے اور یہودیوں کو اللہ کے چنیدہ بندے تسلیم کر لینا ہے۔ جبکہ قرآن کے مطابق یہ جھوٹ اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے' لہٰذا شرک

ہوا۔ گویا خالص دینی لحاظ سے اسرائیل کی یہودی ریاست کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لئے شرک میں مبتلا ہونا ہے جو اسلام میں ناقابل معافی گناہ ہے۔

سچائی کا دین ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ اسلام ابراہیمؑ کا دین ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے دین کے علاوہ کوئی اور دین نہیں ہے۔ لیکن قرآن میں بار بار ذکر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین شرک سے پاک ہے۔ اسرائیل کے جواز کا دعویٰ شرک پر منتج ہونا ہے۔ لہٰذا اسرائیل کو تسلیم کرنے سے گویا مسلمان ابراہیم علیہ السلام کے دین سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ تورات وحی الٰہی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی۔ چنانچہ یہ اسی طرح ہے جیسے انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور قرآن محمد ﷺ پر وحی کیا گیا۔ قرآن خود یہودیوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس جدید وحی کو جو تورات کی تصدیق کرتی ہے اور اب محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے' قبول کرلیں۔

"اور اس کو قبول کرو جو میں نے نازل کی (قرآن) جو اس کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے (تورات) اور اس سے انکار میں پہل نہ کرو"۔ (البقرۃ ۲:۴۱)

جس طرح یہودیوں سے قرآن کو تسلیم کرنے کا مطالبہ ہے اسی طرح مسلمانوں سے تورات کو بطور اللہ کا کلام تسلیم کرنے کا مطالبہ ہے' وہ تورات جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن کیا مسلمان موجودہ تورات میں لکھا ہوا کوئی ایسا مطالبہ تسلیم کریں جو قرآن کی رُو سے غلط ہے؟ قرآن یہودیوں پر الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے تورات میں تحریف کر دی ہے' نتیجتاً یہ مستند نہیں رہی۔ درحقیقت قرآن مجید کا ایک عمل یہ بھی ہے کہ یہ الفرقان یعنی کسوٹی ہے جس سے انسانیت ان تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکتی ہے جو انسانوں نے اللہ کی اصل کتاب' تورات اور انجیل میں کر دی ہیں۔

زیر نظر کتاب اللہ تعالیٰ کی وحی (یعنی القرآن) کو کسوٹی کے طور پر استعمال کرنے کے لئے طریق کار کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن کو کسوٹی بنا کر پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ کیا مندرجہ ذیل کام اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں :

۱) اسمٰعیل علیہ السلام کو اپنے عہد اور میثاق سے خارج کیا؟

۲) کنعان کی متبرک سرزمین (یعنی فلسطین) صرف یہودیوں کو ہمیشہ کے لئے عطا کی؟

۳) یہودیوں کو متبرک سرزمین کا غیر مشروط مالک بنایا؟

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

نبویؐ منہاجِ انقلاب

حفصہ نسرین

الحمد للّٰہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلی اٰلہ واصحابہ ومن والاہ امابعد :

تخلیق آدمؑ کے بعد اللہ رب العزت نے نہ صرف ذریت آدمؑ کی مادی ضروریات کی تکمیل کا بہترین انتظام فرمایا بلکہ اس کے لئے رشد وہدایت اور روحانی تربیت کا بھی مکمل و بہترین اہتمام فرمایا اور اس کام کے لئے انبیاء ورُسل کی آمد کا سلسلہ جاری رکھا جو کہ اپنے اپنے ادوار میں اصلاحِ انسانیت کا کام کرتے رہے اور اپنی اپنی اقوام میں اصلاح کی ذمہ داری کو بطریق احسن پورا کرتے رہے۔ خود حضرت شعیب علیہ السلام کا قول' جو کہ قرآن پاک میں موجود ہے' اس ذمہ داری اصلاح پر دلالت کرتا ہے۔ فرمایا :

﴿ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ ﴾

(ھود : ۸۸)

"میں تو اصلاح ہی کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے"۔

ہر دور میں انبیائے کرام کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تاہم ان انبیاء میں سے کوئی بھی نبی تمام دنیا کے لئے مبعوث نہ ہوئے تھے بلکہ مخصوص حالات میں مخصوص اقوام کی طرف مبعوث ہوئے' حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ ان کے بعد رفتہ رفتہ عام دنیا کے حالات ابتر سے ابتر ہوتے گئے۔ اخلاقی' مذہبی' سیاسی' گویا ہر اعتبار سے دنیا کی حالت نہایت ہی دگرگوں تھی۔ انسان دھیرے دھیرے اشرف المخلوقات کے مرتبے سے گر کر اسفل سافلین کے درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

روما کی عظیم سلطنت کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اس کے نیم وحشیانہ آئین و قوانین بھی مسخ ہو کر اپنے مظالم و مصائب کو اور بھی زیادہ مہیا و موجود اور محاسن کو جو پہلے ہی بہت

کم تھے معدوم و مفقود کر چکے تھے۔ ایران کی شہنشاہی ظلم و فساد کا ایک مخزن بنی ہوئی تھی۔ چین و ترکستان خونریزی و خونخواری کا مامن نظر آتے تھے۔ ہندوستان میں راجہ اشوک اور راجہ کنشک کے زمانے کا نظام و انتظام ناپید تھا۔ مہاراجہ بکرماجیت کے عہد سلطنت کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ نہ بدھ مذہب کی حکومت کا کوئی نمونہ موجود تھا نہ برہمنی مذہب کا کوئی قابل ذکر پتہ و نشان دستیاب ہو سکتا تھا۔ عارف بدھ کا نام عقیدت سے لینے والوں کی یہ حالت تھی کہ حکومت کے لالچ، دنیا طلبی کے شوق اور ضعف کے نتیجہ میں سخت سے سخت قابل شرم حرکات کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ یورپ اگر ایک بیابان گرگستان اور وہاں کے باشندے حیوانوں سے بھی بدتر خون آشام و مردم کش درندے تھے، تو عرب تمام عیوب و فسادات کا جامع تھا اور وہاں کے باشندے حیوانوں سے بھی بدتر حالت کو پہنچ چکے تھے۔ غرضیکہ دنیا کے کسی ملک اور کسی خطہ میں نسل انسانی اپنی انسانیت و شرافت پر قائم نظر نہیں آتی تھی اور بحر و بر سب ماؤف ہو چکے تھے۔ (۱)

اور خود وہ خطہ، جہاں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا، اس کی معاشرتی و اخلاقی حالت کیا تھی؟ وہ شاعر جس کا کلام عربوں کا مایۂ افتخار ہے، صرف موجودہ زندگی کی لذتوں کے گیت گاتا تھا اور لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کو شہہ دیتا تھا، فکر فردا کسی کو نہ تھی۔ (۲)

قانونِ فطرت ہے کہ جب تاریکی شب بہت بڑھ جاتی ہے تو یہ از خود اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اجالا ہونے کو ہے۔ لہٰذا ان بگڑے ہوئے حالات کا فطری تقاضا ایک انقلاب تھا۔ وہ انقلاب جو کہ ہادی اعظم ﷺ کے ذریعہ برپا ہوا۔ وہ انقلاب جس نے تاریخ انسانی کا دھارا موڑ دیا اور انسان کو حشرات الارض کی سی پستی میں سے اٹھا کر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا ؎

جہاں تاریک تھا ظلمت کدہ تھا سخت کالا تھا
کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا تھا

آنحضور ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کے منہاج و خصائص پر بحث کرنے سے قبل مناسب ہو گا کہ انقلاب کے معنی و مفہوم کا جائزہ لیا جائے۔

انقلاب کا معنی و مفہوم

لسان العرب میں انقلاب کے معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں :

والانقلاب الی اللہ عزوجل : المصیر الیہ والتحول وقد قلبہ اللہ الیہ' ھذا کلام العرب ..... والانقلاب الرجوع مطلقا (۳)

المنجد میں انقلاب کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں : اِنْقَلَبَ - یَنْقَلِبُ - اِنْقِلَابٌ "اُلٹ جانا' پلٹنا' مڑنا' سرنگوں ہو جانا"۔ (۴) اور مفردات القرآن میں انقلاب کے معنی کچھ یوں درج ہیں : اَلْاِنْقِلَابُ کے معنی پھر جانے کے ہیں۔ (۵) انقلاب کا مادہ ق ل ب ہے۔ مندرجہ بالا تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ انقلاب کے معنی مکمل تبدیلی اور کسی چیز کے اپنی حالت سے پھر جانے کے ہیں۔ انقلاب ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو کسی حالت و کیفیت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ انقلاب مکمل تبدیلی اور پورے تغیر کا نام ہے۔ (۶) دوسرے الفاظ میں انقلاب ایک ایسی زبردست اور ہنگامہ خیز تبدیلی کا نام ہے جس سے معاشرے کی تسلیم شدہ بنیادوں کو ڈھا کر اس کی تعمیرِ و تشکیل نئے سرے سے کی جاتی ہے۔ (۷)

قرآن حکیم میں لفظ انقلاب کا استعمال

اللہ تعالیٰ سورۂ حج میں فرماتے ہیں :

﴿ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ ﴾ (الحج : ۱۱)

"اور اگر نیچے اس کو فتنہ پلٹ جاوے اوپر اپنے منہ کے"۔

اسی طرح فرمایا :

﴿ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ﴾ (آل عمران : ۱۴۴)

"پھر جاؤ گے اپنی ایڑیوں پر"۔

اسی طرح الاعراف : ۱۱۹' یوسف : ۶۲' المطففین : ۳۱ اور التوبہ : ۹۵ میں بھی انہی معنوں یعنی پھر جانے' پلٹنے اور لوٹنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

حدیث میں لفظ انقلاب کا استعمال

آنحضور ﷺ ایک دعا کثرت سے پڑھا کرتے تھے اور آپ نے اس دعا کو پڑھنے کی تاکید بھی فرمائی ہے :

((یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ)) (۸)

"اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جما دے!"

گویا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے انقلاب برپا کیا تو مراد یہ ہے کہ معاشرے کے مروجہ اصول و قوانین کو اُلٹ پلٹ دیا اور نئے انداز میں معاشرے کی شیرازہ بندی فرمائی۔ دنیا میں حضور ﷺ وہ واحد اور حقیقی قائد انقلاب تھے جنہوں نے دنیا کی تشکیل کا پرانا ڈھانچہ بدل دیا اور دنیا کو سب کچھ نیا دیا۔ آپؐ نے دنیا کو ایک نیا معاشرہ' نیا نظام' نیا ضابطہ اور نیا انسان دیا۔ (۹)

آنحضور ﷺ کی پیدا کردہ تبدیلی کو محض اصلاح نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصلاح کے معنی "درست کرنے" کے ہیں جب کہ آپؐ نے محض اصلاح کے بجائے تمام معاشرہ کی کایا پلٹ دی۔

انقلابِ نبویؐ کا آغاز

اس عظیم انقلاب کا آغاز غار حرا سے ہوا اور انقلابی نعرہ "لا اِلٰہ اِلاّ اللہ محمدؐ رسول اللہ" تھا۔ مروجہ اصطلاحات سے بالکل ہٹ کر یہ ایک نیا جامع انقلابی نعرہ تھا جس سے کفار و مشرکین کے دل دہلے جاتے تھے۔ لا اور اِلاّ کی للکار یہ ثابت کرتی تھی کہ یہ محض ایک مذہب کی نمائندگی نہیں بلکہ پورا ایک نظام ہے جو ایک مکمل ضابطہ حیات کا حامل ہے۔ اس انقلابی دعوت کا آغاز آنحضور ﷺ نے اپنے گھر سے فرمایا۔ جوں جوں یہ دعوت پھیلتی گئی آنحضور ﷺ کی مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جاء الصادق اور جاء الامین کہنے والے ابتداءً آپؐ کو نظرانداز کرتے رہے اور آپؐ کے بارے میں یہ کہا کہ یہ ایک دور اَز کار باتیں سوچنے والا خبطی ہے' ایک انقلاب پسند دیوانہ ہے۔ (۱۰)

اس کلمۂ انقلاب میں ایک معبود کی عبادت کی دعوت تھی۔ اور عبادت محض مذہبی رسوم کا نام نہیں' بلکہ ہر شعبہ زندگی میں الٰہی احکام و قوانین کی اتباع کا نام ہے۔ اسی وجہ سے ساکنان مکہ نے ابتداءً نظراندازی اور تضحیک کے بعد ایک سخت رویہ اپنایا۔ یہ رویہ تشدد کا تھا۔ ہر کلمہ گو کو اور ہر اس شخص کو' جو اس انقلابی تحریک کا کارکن بن جاتا تھا' شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا' اذیتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوئی۔

عدم تشدد کا رویہ

مکہ مکرمہ میں آنحضور ﷺ نے تمام تر توجہ عقیدہ کی مضبوط بنیادیں استوار کرنے پر رکھی۔ یہ دَور عقیدۂ توحید کو دل میں راسخ کرنے کا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ انقلابی تحریک کے کارکنان کی تربیت اس دور کا ایک اہم کام تھا۔ اللہ رب العزت اس عدم تشدد کے رویہ کو یوں بیان فرماتے ہیں :

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ ... ﴾ (النساء : ۷۷)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو...."

آنحضور ﷺ اپنے تمام ساتھیوں کو صبر کی نصیحت فرماتے اور انہیں تشدد کے جواب میں ہاتھ اٹھانے سے منع فرماتے تھے۔ آپؐ کی نظر میں تمام اہمیت اس بات کی تھی کہ اس انقلابی جماعت کے کارکنان کی بہترین طریقہ پر روحانی و اخلاقی تربیت کی جائے تاکہ وہ ہر قیمت پر اپنے نظریہ پر پختگی کے ساتھ جمے رہنے کی صلاحیت حاصل کرلیں۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کا واحد انقلاب تھا جس میں تشدد کا مزاج قطعاً نہ تھا بلکہ رافت و رحمت اور ﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ کا تصور پایا جاتا تھا۔

تزکیۂ نفس

آنحضور ﷺ نے اس انقلابی جماعت کے کارکنوں کا تزکیۂ نفس کیا اور ان کے اندر وہ جذبہ بیدار کیا جس کی بنا پر وہ ان تمام مصائب اور شدائد کو نہایت صبر سے برداشت کرنے پر تیار ہو گئے۔ آپؐ نے ان تمام مسلمانوں کے نفوس سے تمام بیماریوں کی بیخ کنی کی اور ان کی تربیت اس انداز میں فرمائی کہ نفس امارہ سے نفس مطمئنہ تک کا سفر ان کے لئے سہل ہو جائے۔ آپؐ کی تمام جدوجہد کی غرض و غایت اور مقصود و منتہاء انسانی نفوس کا تزکیہ تھا۔[11] قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مقاصد بعثت میں تزکیۂ نفس کا ذکر بار بار فرمایا ہے۔

فطری انقلاب

آنحضور ﷺ نے جو انقلاب برپا فرمایا اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ نے انسانی فطرت کو اس کے اصل مقام پر ہی رکھا۔ یعنی اس انقلابی تحریک میں شامل

ہونے والوں کے لئے یہ شرط قطعاً نہ تھی کہ یہ لوگ کھانا پینا' اہل و عیال کے ساتھ رہنا چھوڑ دیں۔ عیسائیت کے پھیلائے ہوئے رہبانیت کے تصور کی بھی نفی کر دی گئی اور اس تصور کو بھی جھٹلا دیا گیا کہ انسان کے لئے فلاح کا راستہ بس یہی ہے کہ مادی وسائل اور دنیا سے رابطہ بالکل ختم کر لے۔ بلکہ آپؐ نے فطری تقاضوں کی ماہیتیں بدل کر انہیں شریعت کے تحت کر دیا۔

فاران کی چوٹیوں سے اصلاح کی جو دعوت شروع ہوئی تھی وہ فطرت انسانی کے بدلنے کی غرض سے نہ تھی بلکہ اس کا مقصد انسانی عادتوں کی دھاتوں کو خالص سانچوں میں ڈھال کر اچھی شکلوں میں تبدیل کرنا تھا اور ان کے اظہار کے لئے راستوں کا مقرر کرنا تھا۔ (۱۲) آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی فطرت و جبلت کو قائم رکھتے ہوئے نہایت عمدگی سے دین انقلاب کے مطلوبہ سانچے میں ڈھل جائے۔ آپؐ نے اس انقلابی تحریک کے کارکنان کی تربیت ایسی عمدگی سے کی کہ اقوامِ سابقہ کے برعکس انہوں نے اللہ اور عباداللہ سے بہترین انداز میں تعلق قائم کیا۔ اور یہ زمانہ آ گیا کہ انسان وہی تھے لیکن ان کے دلوں کی دنیا بدل گئی تھی' حلت و حرمت کے پیمانے بدل گئے تھے' تہذیب و تمدن کے انداز بدل گئے تھے۔ یہی تھا وہ عظیم انقلاب جو حضور ﷺ نے دنیائے عرب میں برپا کیا جس سے سرزمین عرب ہی کیا ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچا' ایک بھونچال آیا جس نے طاغوتی و جبروتی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا..... عمرؓ جیسے معزز قریشی بھی بلال حبشیؓ کو "یا سیدی" کہہ کر پکارنے لگے۔ (۱۳) اس انقلاب میں اشتراکی انقلاب کی طرح انسان کو اس کی فطری حاجات و خواہشات سے روکنے کی کوئی شق نہ تھی۔

ہجرت مدینہ۔ نبوی انقلاب کا ایک اہم سنگ میل

بعثت نبویؐ کے ۱۳ سال بعد آنحضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے اذنِ ہجرت ملا۔ اس ہجرت نے اس انقلاب کا رخ ایک نئی سمت میں موڑ دیا۔ مکی دور کی تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے بھی صبر کا حکم دیا۔ یہ تمام دور جہاد کا تو تھا لیکن قتال کا نہیں۔ اب قتال کا حکم تھا اور آپؐ کا انقلاب اب قتال یعنی جہاد بالسیف کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب تصادم کا دوسرا مرحلہ یعنی مسلح تصادم کا وقت تھا۔ تصادم کا آغاز درحقیقت انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے اور تصادم انقلاب کا ناگزیر خاصہ ہوتا ہے۔ (۱۴)

اقدام اور مسلح تصادم کا مرحلہ

مکی دور تربیت کا دور تھا۔ صبر کی حکمت یہ تھی کہ انقلابی جماعت کے ارکان خود کو اس حد تک پختہ کرلیں کہ پھر مسلح تصادم کا مرحلہ آئے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑنے میں کوئی عار نہ سمجھیں۔ ہجرت ایک کسوٹی تھی جس نے کھرے کھوٹے کو الگ الگ کر دیا۔ اب جبکہ کھرے اور مخلص لوگوں کی جماعت ایک جگہ جمع تھی تو یہ ضروری تھا کہ کفار پر اپنی عسکری طاقت کو بھی واضح کیا جائے۔ لہٰذا آنحضور ﷺ نے غزوۂ بدر سے قبل ۸ مہموں کا اہتمام کیا جن میں سے چھ میں خود تشریف لے گئے اور دو میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہی بھیجا۔ اس کے علاوہ آپؐ نے مکہ کی تجارتی شاہراہ پر رکاوٹیں پیدا کرنے کا آغاز فرمایا۔ حضورؐ نے درحقیقت قریش کی رگِ جان (Life Link) پر ہاتھ ڈالا' ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنادیا اور اس طرح ان کی معاش کے لئے ایک خطرہ کھڑا فرمادیا۔ (۱۴) اس کارروائی کا مقصد کفار کو یہ احساس دلانا تھا کہ اب ہم تمہارے ہاتھوں اذیتیں برداشت کر کے چپ رہنے والے نہیں بلکہ ایک طاقت ہیں اور ایسی طاقت کہ تمہارا سامانِ خورد و نوش تک تم سے چھین سکتے ہیں۔ گویا ہجرت کے ساتھ ہی مراحل انقلاب میں سے پانچواں مرحلہ یا یوں کہئے کہ تصادم کا دوسرا مرحلہ (Phase) شروع ہوگیا۔ (۱۶)

لہٰذا اس دور میں آنحضور ﷺ ایک مدبر جرنیل اور کامیاب سیاستدان کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اور مکی دور کے بالکل برعکس یہ دور مسلح تصادم کے واقعات سے بھرپور ہے۔ غزوۂ بدر سے لے کر غزوۂ احزاب تک کا زمانہ اس انقلاب کے مسلح تصادم کا زمانہ تھا۔ اور کفار نے تمام عرب کے جمع ہونے کے باوجود بھی سمجھ لیا کہ اب یہ انقلاب نہ صرف عرب کے اندر پھیلے گا بلکہ بیرونِ عرب بھی اسی کا بول بالا ہوگا۔ دوسری طرف اب ہجرت کے بعد مسلمانوں کو ایک محفوظ ٹھکانہ میسر آگیا تھا' جہاں سیاسی طور پر بھی مسلمانوں کو برتر پوزیشن حاصل تھی' چنانچہ وہاں گویا ایک باقاعدہ اسلامی ریاست ابتدائی درجے میں معرضِ وجود میں آ چکی تھی۔ اس کیلئے قواعد اور ہر شعبہ زندگی سے متعلق اُمور میں احکامات و ہدایات کا ہونا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا اب ہم انقلاب نبویؐ کے اس رُخ کا جائزہ لیں گے جو کہ ریاست مدینہ کے قیام کے بعد سامنے آتا ہے۔

سیاسی انقلاب

آنحضور ﷺ نے مروجہ سیاسی نظام کو جو کہ کسی ایک مرکز کے بجائے قبائلی سرداری پر مشتمل تھا' ترک کر کے نیا اور مفید سیاسی نظام پیش کیا۔ آپؐ نے سردار یا حاکم کے عوام الناس سے برتر ہونے کے تصور کو جھٹلا کر((سیدالقوم خادمهم)) کا تصور دیا۔ گویا انسانوں کے انسانوں پر تسلط کو ختم کر دیا اور اللہ رب العزت کے پیش کردہ اصول ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ کو حقیقتاً نافذ کر دیا۔ دنیا کا پہلا منشور "میثاق مدینہ" وجود میں آیا جس کی حیثیت ریاست مدینہ کے عبوری دستور کی تھی۔

درحقیقت حضور اکرم ﷺ کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا۔ جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی وہاں تمدن کی درستی بھی مطلوب تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضور اکرم ﷺ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا اور اس کی اصلاح اس کے جملہ تمدنی رابطوں سمیت کرنا چاہی۔(۱۷)

آپؐ کے برپا کردہ انقلاب کا عملی مظہر خلافت راشدہ کے خاتمہ تک اپنی اصل شکل میں جلوہ گر رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ راتوں کو گشت کرتے نظر آتے ہیں' تاکہ خبر رکھ سکیں کہ کسی کی کوئی ضرورت پوری ہونے سے رہ تو نہیں گئی۔

اقتصادی انقلاب

آنحضور ﷺ نے زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ اقتصادی شعبہ میں بھی انقلاب برپا کیا۔ ایک ایسے معاشرے میں' جہاں ناداروں کا کوئی پرسان حال نہ تھا' آپؐ نے گردشِ زر کا بہترین اصول دے کر ان غریبوں کی مدد فرمائی۔ سود کا خاتمہ کیا' جو کمزور طبقہ کے لہو کو کسی موذی جانور کی طرح چوس رہا تھا۔ اللہ رب العزت نے ﴿ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ کا حکم دیا۔ آپؐ نے اسے حقیقتاً نافذ فرمادیا اور فرمایا :

((من آتاه الله مالاً فلم يود زكاته مثل له يوم القيمة شجاع اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيمة ثم ياخذ بلهزمتيه يعنى شدقيه ثم

يقول انا مالک انا کنزک۔ ثم تلا ﴿ وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ ..... الاية)) (۱۸)

"جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کا مال گنجے سانپ کی شکل میں اس کے پاس لایا جائے گا' اس کے دو لمبے دانت ہوں گے اور وہ سانپ قیامت کے دن اس کے گلے کا طوق بن جائے گا' پھر اس کے دونوں جبڑوں کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں' تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی : "جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس گمان میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں' یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا"۔

اشتراکی جس گردشِ دولت کا راگ الاپتے ہیں اور جو انقلاب لاکھوں انسانوں کا خون بہانے کے بعد لائے ہیں اس کی بنیاد بہترین اور مفید ترین شکل میں چودہ سو برس قبل رکھ دی گئی تھی' جب کہا گیا :

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ ﴾ (التوبۃ : ۳۴)

"اور جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے"۔

ایک جدید فلاحی مملکت حتیٰ کہ کمیونزم بھی اقتصادی انصاف میں ان حدود سے آگے نہیں جا سکتی جو سرورِ کائنات ﷺ نے متعین فرمائی ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں ان دونوں کا مقصد ضرورت مندوں کو "کھانا کھلانا" ہے۔ بشرطیکہ اس کھانا کھلانے کو اس کے لغوی معنوں میں نہ لیا جائے۔ (۱۹)

علمی و سائنسی انقلاب

عربوں کے ہاں لکھنے پڑھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ توہم پرستی کی بنیادی وجہ ہی جہالت

تھی۔ اسی لاعلمی کا شاخسانہ تھا کہ کوئی ستاروں کو پوجتا تھا' کوئی سورج کو دیوتا مانتا تھا۔ مظاہر فطرت سے خوفزدگی علم کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہی تھی۔ حتیٰ کہ یورپ بھی اندھیروں کا شکار تھا' اور ہائی پیشیا جیسی معلمہ کو بہیمانہ انداز میں قتل کر دینا اسی لاعلمی و جاہلیت کا مظہر تھا۔

آپؐ نے علم پر توجہ دی' حصول علم کو ضروری قرار دیا اور اللہ کے فرمان کو بصراحت پیش کیا : ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (الزمر : ۹) "آپ کہہ دیجئے: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟" اور آنحضورؐ نے علم و حکمت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا : ((اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا هُوَ اَحَقُّ بِهَا))[۲۰] "حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے' وہ اسے جہاں پائے اس کا زیادہ حقدار ہے"۔

یورپ جس سائنسی ترقی کا علمبردار ہے' اس سائنس کا آغاز پیغمبر انقلابؐ نے ہی کیا تھا۔ مشاہدہ اور تحقیق کی طرف اللہ نے اس انداز میں توجہ دلائی ہے :

﴿ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ○ وَاِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ○ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ○ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ○ ﴾ (الغاشیہ : ۱۷-۲۰)

"کیا نہیں دیکھتے اونٹوں کی طرف کہ کیونکر پیدا کئے گئے اور آسمان کی طرف کہ کیونکر بلند کیا گیا اور پہاڑوں کی طرف کہ کیونکر گاڑے گئے اور زمین کی طرف کہ کیونکر بچھائی گئی"۔

آنحضورؐ کی یہ دعا سائنسی طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہے :

((اَللّٰهُمَّ اكْشِفْ لِيْ وُجُوْهَ الْحَقَائِقِ))

"اے اللہ میرے لئے حقائق کو کھول دے"۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور داعی اسلام' یعنی داعی انقلاب معاشرے میں موجود اندھی تقلید کے رجحان کے برعکس غور و فکر اور مشاہدہ کی طرف دعوت دیتے تھے۔ گویا گمراہوں کو راہ راست پر لانا' دانائی سکھانا اور پاکیزہ بنانا پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم کا طرہ امتیاز تھا۔ جاہل قومیں عقل مند بن گئیں۔ خونخوار' وحشی' شراب خور اور درندہ

صفت 'پاکباز' رحیم 'شفیق اور امین بن گئے۔ جرائم کا نشان مٹ گیا۔ (۲۲)

غیر خونی انقلاب

آنحضور ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کی نہایت اہم اور سب سے زیادہ قابل تحسین خوبی یہ ہے کہ یہ انقلاب بلاشبہ غیر خونی انقلاب تھا۔

دنیا کا عظیم ترین اسلامی انقلاب غارِ حرا' دارِ ارقم' حرمِ کعبہ' سوقِ عکاظ' شعب بنی ہاشم' غارِ ثور' مسجد قبا' بدر و اُحد اور خندق و حنین سے ہوتا ہوا فتح مکہ پر منتج ہوتا ہے۔ اور اس آخری معرکے میں کسی کا خون نہیں بہتا۔

حضور ﷺ نے ہر معاملہ میں اور ہر مرحلہ پر حتی الامکان کوشش کی کہ تعمیر کی جائے تخریب نہ ہو۔ روایتی طور پر لاشوں کا مثلہ کرنے کا رواج تھا' آپؐ نے اس کی ممانعت فرمائی۔ قیدیوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا' یہاں تک کہ دس سالہ مدنی دور مسلح تصادم سے بھرپور ہے' لیکن اس میں انسانی جان کی ارزانی اس حد تک بھی نہیں ہے جتنی کہ عربوں کے ہاں صرف ایک جنگ میں ہوا کرتی تھی۔

صدر اول کا یہ عظیم ترین اسلامی انقلاب تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اتنے بڑے انقلاب میں مقتولین کی تعداد اتنی کم ہے کہ اسے غیر خونی انقلاب کہا جاسکتا ہے۔ (۲۳) اگر ہم اپنے جدید دور کے انقلابات پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی خون کی جتنی ناقدری اس جدید دور کے مہذب لوگوں نے کی ہے تاریخ انسانی کے عظیم ترین انقلاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔

فرانس نے جب جمہوریت کے لئے ایک جمہوری انقلاب برپا کیا تو اس کے لئے اسے اتنی قربانی دینی پڑی کہ فرداً فرداً انسانوں کو قتل کرنا وہاں ممکن نہ رہا تو گلوٹین ایجاد کرنی پڑی جو انسانوں کے سروں کو ناریلوں کی طرح اڑا دیتی۔ حصولِ جمہوریت کی اس مشین کو فرانس کے اندر جگہ جگہ بستیوں کے چوکوں میں نصب کیا گیا تاکہ آنے والی جمہوریت کی دیوی کے سامنے انسانی خون کا بے بہا ہدیہ پیش کیا جاسکے۔ چنانچہ اس انقلاب جمہوریت کے لئے' جو بعد میں صرف لفظوں کی بازی گری بن کر رہ گیا' اندازاً ۴۴ لاکھ انسانوں کو گلوٹین کی بھینٹ چڑھایا گیا اور ہر سفید پوش انسان کو تلوار کی دھار پر سے گزار دیا گیا۔

اسی طرح جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا جو خود بھی صرف نصف انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرنے کا مدعی تھا تو ایک کروڑ سے زائد انسان قتل و غارت اور برفانی قید خانوں میں موت کے حوالے کر دیئے گئے۔ (۲۴) جبکہ نبویؐ انقلاب میں مقتولین کی تعداد انتہائی حیرت انگیز حد تک کم ہے۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال و اسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں' لیکن نبی اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زائد نہ ہو گی جو اس ساری جدوجہد کے دوران حضور ﷺ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے۔ پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں برپا ہونے والے اس انقلاب میں ہمیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا ہے کہ کسی کے ناموس پر دست درازی ہوئی ہو۔ (۲۵)

ماحصل

نبویؐ انقلاب ایک ایسا جامع موضوع ہے کہ اس پر جو کچھ بھی لکھا جائے اور اس کے جتنے بھی خصائص بیان کئے جائیں پھر بھی ان حیرت انگیز اثرات کا مکمل احاطہ کرنا بہت مشکل ہے جو اس انقلابِ عظیم کی بدولت مرتب ہوئے۔ یہ ایک نادر و نایاب انقلاب ہے۔ ایک ایسا نور جو غارِ حرا سے پھوٹا' داعیٔ عظیم کی زبان سے لا اِلٰہ اِلاّ اللہ بن کر نکلا' یہ اولین اعلانِ توحید جو کوہِ صفا پر ہوا تھا رفتہ رفتہ اذانِ بلالیؓ بن کر گونجنے لگا۔ پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد تمام عرب سے اسی صدائے لا اِلٰہ اِلاّ ھو کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ یہ معجزہ تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار رونما ہوا تھا کہ ایک فرد محمد (ﷺ) نے دعوت کا آغاز بھی فرمایا' ابلاغ و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے جملہ تقاضے بھی پورے کئے' پھر جن لوگوں نے دعوت کو قبول کیا انہیں نہ صرف جمع کیا بلکہ ایک نہایت مضبوط اور محکم تنظیمی سلسلے میں منسلک کیا' پھر ان کا تزکیہ بھی کیا اور تعلیم و تربیت کے تمام تر تقاضے بھی پورے کئے۔ پھر اولاً عدم تشدد اور صبر محض' پھر اقدام اور چیلنج اور بالآخر مسلح تصادم کے مراحل سے بھی

گزارا' اور ہر مرحلے پر بنفس نفیس خود ہی قیادت فرمائی حتیٰ کہ سپہ سالاری کے جملہ فرائض بھی ادا کئے اور کل بیس برس کے عرصہ میں یہ سارے مراحل طے کر کے لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے ملک میں انقلاب کی تکمیل فرمادی اور اللہ کے دین کو غالب کر دیا۔ (۲۶)

اگرچہ یہ نہایت ہی محیرالعقول واقعہ ہے اور اسے معجزہ کہا جا سکتا ہے' تاہم یہ بات لازماً ذہن میں رہنی چاہئے کہ ارشاد ربانی ہے : ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ "نہیں ہے انسان کے لئے مگر جس کی وہ کوشش کرے"۔ یقیناً بدر کے میدان میں فرشتے نصرتِ الٰہی کے ساتھ اُترے تھے لیکن نہایت بے سروسامانی کے باوجود کفار کے لشکر جرار کا سامنا کرنے کا مضبوط اور بہت دلیرانہ فیصلہ کرنے کے بعد۔ بلاشبہ نبی ﷺ کو تائید الٰہی حاصل تھی لیکن اس راہ میں جتنی مشکلات آپؐ نے برداشت کیں کسی اور نے نہ کیں۔ جن آزمائشوں سے آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم گزارے گئے وہ ہمارے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ دراصل کسی بھی کام کو کامیابی سے انجام تک پہنچانے کے لئے اخلاص بہت ضروری ہے اور داعیٔ انقلاب محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے کارکنان میں یہ اخلاص انتہا تک موجود ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اتنا بڑا انقلاب نہایت قلیل عرصہ میں اور بہت پُرسکون انداز میں انجام پاگیا۔ قرنِ اوّل کے ان عظیم مجاہدوں کی زندگیاں ایسی حیران کن ہیں کہ اگر تاریخی شواہد موجود نہ ہوں تو یہ محض فرضی داستانیں ہی محسوس ہوں ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

ایک طرف انقلابِ فرانس میں گلوٹین سے سر کاٹنے کا منظر دیکھیں اور دوسری طرف فتح مکّہ کا مبارک دن ذہن میں لائیں اور اس آواز کو سنیں جو اس عظیم ہستی رحمۃٌ للعالمین ﷺ کے مبارک لبوں سے ادا ہوتی ہے۔ "اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ"۔ یہ لوگ جن کو معاف کر دیا گیا ہے ان میں بدترین دشمن بھی ہیں اور وہ بھی جنہوں نے اذیتیں دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ صرف چار یا پانچ لوگوں کو قتل کرنے کا حکم ہوتا ہے اور پھر ان میں سے بھی نصف معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

کیا دنیا ایسے انقلاب کی کوئی بھی مثال پیش کر سکتی ہے؟ قطعاً نہیں۔ جو صفات سیدنا محمد ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں جمع تھیں وہ کسی اور میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس انقلاب نے کسی انسان کو سرمایہ دارانہ نظام میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو کر تڑپنے سسکنے کا موقع نہیں دیا۔ کسی ذی روح کو سائبریا کے برفانی کیمپوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ اس انقلاب نے عورت کو مصنوعات کی نمائش کی آڑ میں کھلونا یا شوپیس نہیں بنایا اور نہ ہی اسے مشترکہ ملکیت کے زمرے میں شامل کیا' بلکہ اسے وہ عزت دی جس کی دنیا میں کوئی بھی مثال نہیں ہے۔ اس انقلاب نے جاگیردارانہ انداز میں ایک انسان پر دوسرے انسان کے تسلط کو بھی ختم کر دیا۔

دوسری طرف یہ ایک جامع انقلاب ہے۔ آپؐ نے محض قومیت' محض اخلاق یا محض اقتصادی اصلاح کا بیڑہ نہیں اٹھایا بلکہ ایک مضبوط عقیدہ پر جمانے کے بعد اور تزکیۂ نفس کے ساتھ ان سب کی اصلاح فرمائی۔ کیا اب بھی ہمیں ضرورت ہے کہ ہم مغرب سے جمہوریت مستعار لے کر اپنی جانیں عذاب میں ڈالیں؟ یا مارکس لینن کے اندھے قوانین پر چل کر اپنے ان حقوق کو' جو شریعت اسلامیہ نے ہمیں دیئے ہیں' از خود ہی ساقط کر لیں؟ اس وقت یہ فیصلہ خود امت مسلمہ کے ہاتھ میں ہے کہ اسے کیا کرنا ہے؟ اور اگر ہم نے اب بھی فیصلہ نہایت معاملہ فہمی سے نہ کیا تو پھر ؎ "ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔

ان چند صفحات میں نہایت اختصار سے نبویؐ منہاجِ انقلاب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس وقت جن ابتر حالات کا شکار ہیں ان کو اس انقلاب کے طریق پر چلتے ہوئے کس طرح درست کیا جا سکتا ہے ـــــ وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ

حواشی

(۱) اکبر شاہ نجیب آبادی' مولانا۔ تاریخ اسلام' ص : ۱۶

(۲) امیر علی' سید۔ رُوحِ اسلام (مترجم ہادی حسین) ص : ۶۲

(۳) ابنِ منظور افریقی۔ لسان العرب۔ ج ۱۔ ص : ۶۸۶

(۴) المنجد۔ ص : ۱۳۲۵

(۵) راغب اصفہانی، امام۔ مفردات القرآن۔ ص : ۷۶۲
(۶) خالد علوی، ڈاکٹر۔ انسان کامل۔ ص : ۱۹۴
(۷) خورشید احمد گیلانی، صاحبزادہ۔ روحِ انقلاب۔ ص : ۹
(۸) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، جامع ترمذی۔ ج ۴، ص ۴۴۸
(۹) اسعد گیلانی، سید، رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب۔ ص ۴۵۶
(۱۰) امیر علی، سید، روح اسلام۔ ص ۴۳۷
(۱۱) شبیر احمد منصوری۔ مجلہ القلم۔ ص ۴۳
(۱۲) ابو احمد عبداللہ لودہانوی۔ عالمی مشکلات کا یقینی حل۔ ص ۴۰
(۱۳) خادم حسین شاہ انجم۔ ہادی کامل۔ ص ۲۸۹۔۲۹۰
(۱۴) اسرار احمد، ڈاکٹر۔ منہج انقلابِ نبویؐ۔ ص ۱۰۰
(۱۵) اسرار احمد، ڈاکٹر۔ منہج انقلابِ نبویؐ۔ ص ۱۴۱۔۱۴۲
(۱۶) اسرار احمد، ڈاکٹر۔ منہج انقلابِ نبویؐ۔ ص ۱۲۶
(۱۷) نعیم صدیقی۔ محسن انسانیت۔ ص ۳۸
(۱۸) محمد بن اسماعیل بخاری، امام۔ الجامع الصحیح البخاری۔ ج ۲ ص ۱۱۱
(۱۹) کوثر نیازی، مولانا۔ پیغمبر انقلاب۔ نقوش رسول نمبر۔ ج ۴، ص ۲۸
(۲۰) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی۔ جامع ترمذی۔ ج : ۳۔ ص ۳۸۲
(۲۱) عبدالرحمٰن، منشی۔ اسلام اور انقلاب۔ ص ۱۹۶
(۲۲) خورشید احمد گیلانی، صاحبزادہ۔ روحِ انقلاب۔ ص ۴۶
(۲۳) وحید الزمان خان، مولانا۔ پیغمبر انقلاب۔ ص ۸۲
(۲۴) اسعد گیلانی، سید۔ رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب۔ ص ۲۵۸۔۲۵۹
(۲۵) امین احسن اصلاحی، مولانا۔ سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر۔ ج ۲، ص ۳۴
(۲۶) اسرار احمد، ڈاکٹر۔ برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں، ص ۶۹

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کتابتِ مصاحف اور علمِ ضبط(۶)

علاماتِ ضبط کی ابتداء، ان کے متنوع ارتقاء اور ان کے زمانی اور مکانی ممیّزات کا اجمالی جائزہ

——— پروفیسر حافظ احمد یارؒ ———

۴۴۔ اور اسی قسم کی مد (بحذفِ حرفِ مد) کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ اسم جلالت کی لام کے اشباع (مد اصلی) کا طریقہ کتابت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تمام عرب اور افریقی ممالک بلکہ ترکی اور ایران میں بھی اسم جلالت یوں لکھا جاتا ہے: "اللّٰہ"۔ حالانکہ تلفظ میں یہ لفظ "اَلّٰہ" نہیں بلکہ "اَلاَّہ" ہے۔ بلکہ لام کے اشباع (مد) کے علاوہ اس (لام) کی تفخیم اور ترقیق علمِ تجوید کا ایک اہم قاعدہ ہے۔(۱۱۱)

☆ مرحوم خطاط طاہر الکردی نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں اپنے وہ انیس سوالات (اور ان کے وصول شدہ جوابات) نقل کئے ہیں جو انہوں نے شیخ علی محمد الضباع (اس وقت کے شیخ القاریٰ المصریۃ) کو لکھے تھے۔ ان سوالوں میں سے بیشتر کا تعلق رسم اور ضبط سے ہے۔(۱۱۲) ان میں یہ سوال بھی تھا کہ مصحف امیری (مصری مصحف الملک) میں لفظ جلالت "اللّٰہ" پر علامتِ مد کیوں نہیں ڈالی گئی؟ حالانکہ اس میں "حتٰی" "الٰی" "علٰی" وغیرہ کی طرح مد طبیعی موجود ہے۔(۱۱۳) شیخ القاریٰ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔ مثلاً ایک جواب تو یہ تھا کہ چونکہ یہ لفظ عام اور بکثرت استعمال ہوتا ہے اس لئے ضرورت نہیں۔ اس طرح تو پھر ھذا، ذلک وغیرہ پر علامت مد ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ اسے "اللّٰت" (جسے عرب ممالک کے ضبط کے مطابق "اَللّٰت" لکھتے ہیں) سے ممتاز کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس روایتِ قراءت کی بنا پر جس میں "اللت" بصورت وقف "اللّٰہ" ہی پڑھا جاتا ہے۔(۱۱۴) اللّٰہ کو "اللت" سے رسماً اور ضبطاً ممتاز کرنے کے لئے اس طرح لکھنے کی بحث صاحب الطراز نے بھی کی ہے۔(۱۱۵) لیکن یہ جواب اس لئے معقول نظر نہیں آتا کہ علامتِ ضبط کے فرق کے باوجود

تلفظ تو دونوں جگہ ایک ہی رہا۔ (۱۱۶) اصل میں یہ فرق قراء ت میں لام جلالت کی قراء ت تفخیم کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ "اللت" میں ماقبل مضموم ہونے کے باوجود لام کی تفخیم نہیں ہوگی' کیونکہ اسے علم التجوید میں صرف لفظ جلالت کی خاصیت قرار دیا گیا ہے۔ (۱۱۷)

☆ حقیقت یہ ہے کہ عرب اور افریقی ممالک میں الف مدہ محذوفہ میں ماقبل کی فتحہ لکھے بغیر مد کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس لئے وہ اسم جلالت کے لام پر شد اور فتحہ ڈالتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ مد کی خاطر الف فتحہ کا اثبات بھی کیا جائے تو پھر اسے "اللّٰہ" لکھنا پڑے گا جو ان کے ضبط کے مطابق "اَللّٰت" سے مشابہ ہی ہو جائے گا۔ اس لئے ان تمام ملکوں میں یہ لفظ (جلالت) غلط علامت ضبط کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس کا درست پڑھنا صرف شفوی تعلیم پر منحصر ہے۔

☆ صرف برصغیر میں لامِ جلالت کی اس مد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے "اللّٰہ" لکھا جاتا ہے یا پھر چین میں اسے "اللّٰہ" لکھا جاتا ہے۔ تلفظ کے تقاضوں کے مطابق اس معاملے میں عرب اور افریقی ممالک یا ایران اور ترکی سب کا طریق ضبط ناقص ہے۔ برصغیر کی تازہ ترین ایجاد اس معاملے میں یہ ہے کہ اب تجویدی قرآن (مطبوعہ پاکستان) میں لام جلالت کی تفخیم یا ترقیق کے لئے دو الگ الگ علامات ضبط اختیار کی گئی ہیں (۱۱۸)۔ اور لفظِ جلالت کے تمام تجویدی تقاضوں کے مطابق یہ اس کے لئے بہترین ضبط ہے۔

۴۵۔ علم الضبط کے مسائل میں "زیادۃ فی الھجاء" یا حروفِ زوائد کا مسئلہ بھی اہم ہے یعنی وہ حروف جو ــــ رسم عثمانی کے مطابق ــــ لکھے جاتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے' مثلاً مِائۃ' جایٔ ءَ اور لِشاْیٔ وغیرہ کا الف' اولئک' اُولی یا اُولو وغیرہ کی واو' نباء ی یا تلقاء ی وغیرہ کی "یاء"' واو الجماعۃ کے بعد لکھا جانے والا الف' جسے الف الاطلاق کہتے ہیں (۱۱۹) اور ضمیر واحد متکلم (اَنا) کے آخر پر آنے والا الف وغیرہ۔ (۱۲۰)

عرب اور افریقی ممالک میں اس قسم کے زائد "الف"' "و" یا "ی" پر ایک علامتِ زیادۃ یا "عدم نطق" ڈالی جاتی ہے جو عموماً ایک بیضوی شکل کا دائرہ (0) ہوتا ہے۔ ھجاء کے ان زوائد پر یہ علامت ڈالنے کا رواج بہت پرانا ہے۔ "نَقْط المصاحف" کے طریقے میں بعض دفعہ اس مقصد کے لئے صرف سرخ نقطہ بھی استعمال ہوتا تھا۔ الخلیل نے

اس کے لئے کوئی الگ علامت وضع نہیں کی تھی۔ اس لئے بعد میں بھی یہی سرخ گول دائرہ (دارۃ حمراء) اس مقصد کے لئے مستعمل رہا۔ [۱۲۱] بلادِ عرب اور افریقی ممالک کے اندر رائج طریقے پر مصحف میں حروفِ زوائد (محتاجِ دائرہ) کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے، خصوصاً الف الاطلاق کو بھی شامل کر لینے کی بنا پر۔

☆ اہل مشرق نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو حرفِ زائد نطق میں نہیں آتا اسے ہر قسم کی علامتِ ضبط سے معریٰ رکھا جائے۔ اس طرح حرفِ الف کی چند معدود صورتیں ایسی رہ جاتی ہیں کہ ان میں التباس واقع ہو سکتا ہے۔ مثلاً الف ماقبل مفتوح جب کہ اس کے بعد کوئی حرفِ ساکن یا مشدد بھی نہ آرہا ہو۔ یہ کوئی بیس کے قریب مقامات بنتے ہیں لہٰذا صرف ان پر علامت زیادۃ (دائرہ یا علامت تنسیخ x) لگا دیتے ہیں۔ اس طریقے پر نہ اولٰئک کی واو پر نشان لگانے کی ضرورت ہے نہ تلقاءی کی "ی" پر اور صرف الف الاطلاق پر ہی یہ علامت نہ ڈالنے کے باعث مجموعی طور پر شاید کاتب کے کئی دن نہیں تو کئی گھنٹے یقیناً بچ جاتے ہیں۔

بعض لفظوں کے بارے میں یہ اختلاف بھی ہوتا ہے کہ اس میں زائد الف ہے یا "ی"۔ مثلاً "اَفَائن" اور "مَلَائه" میں۔ [۱۲۲] اس لئے ان کی علامت زیادۃ کے موقع ضبط کی تعیین میں بھی اختلاف موجود ہے۔ [۱۲۳]

۴۶۔ علم الضبط کے مسائل میں سے ایک مسئلہ نقص فی الھجاء والے کلمات کا ضبط بھی ہے یعنی ایسے حروف جو لکھے نہیں جاتے مگر پڑھے ضرور جانے چاہئیں۔ مثلاً الرحمن اور العلمین کا الف، داوٗد اور تلون کی دوسری واو اور رامیّن اور نبیّن کی دوسری یا (ی)۔ یہ محذوف حرف عموماً الف، و، ی ہی ہوتا ہے اور وہ بھی "مدہ"، اگرچہ ایک دو جگہ "ن" بھی محذوف ہوا ہے۔ [۱۲۴] دورِ طباعت سے پہلے قلمی مصاحف میں ان محذوفات کا "اثبات" باریک قلم اور سرخ سیاہی سے کیا جاتا تھا۔ یعنی سرخی سے حسب موقع "ا" یا "و" یا "ی" یا "ن" لکھ دیتے تھے۔ دورِ طباعت میں یہ حروف متن کی سیاہی کے ساتھ مگر باریک قلم سے لکھے جانے لگے ہیں۔

☆ مگر اس میں بھی اہل مشرق حرف (محذوف) کا اضافہ کرنے کی بجائے الف مدہ محذوفہ کے لئے (ـٰـ)، واو مدہ محذوفہ کے لئے (ـٗـ) اور یائے مدہ محذوفہ کے لئے

(ـــ) کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ البتہ "ن" کو وہ بھی باریک قلم سے ہی لکھتے ہیں' مثلاً "نُنجِی"۔

حرف محذوف الف' "و" یا "ی" عرب ممالک کے طریقے کے مطابق تو الرحمٰن' صٰلِحٰت' داوٗد' تَلوٗن' اُمِّیّٖن اور نَبِیّٖن لکھیں گے مگر برصغیر کے ضبط کے مطابق یہی کلمات علی الترتیب یوں لکھے جائیں گے : الرحمٰن' صٰلحٰت' داوٗد' تلوٗن' اُمِّیّنَ اور نَبِیّنَ۔ نوٹ کیجئے کہ تمام کلمات کا اصل عثمانی رسم' ضبط کی دونوں صورتوں میں برقرار رہا ہے' صرف علاماتِ ضبط کا فرق ہے۔ [۱۲۵]

۷۴۔ علاماتِ ضبط کا ایک اور اہم مسئلہ ہمزۃ الوصل کا ضبط ہے۔ [۱۲۶] اس کے لئے الف الوصل کے اوپر ایک مخصوص علامت ڈالی جاتی ہے جسے "صلہ" یا "علامۃ الصلۃ" کہتے ہیں [۱۲۷] الخلیل سے پہلے یہ علامت عموماً ایک ہلکی سرخ لکیر (جرہ لطیفہ) ہوتی تھی۔ [۱۲۸] بعد میں بعض علاقوں میں اس کے لئے گول سبز نقطہ لگایا جانے لگا اور بعض علاقوں میں سرخ نقطہ ہی لگا دیتے تھے۔ [۱۲۹]

☆ الخلیل نے اس کے لئے "صـ" کی علامت وضع کی' جو حرف صاد (ص) کے سرے سے ماخوذ ہے اور جو ہمیشہ الف الوصل کے اوپر ہی لکھی جاتی تھی اور بیشتر عرب ممالک میں اب بھی لکھی جاتی ہے۔ چوتھی صدی ہجری سے ہی ہمزۃ الوصل کی علامت مطلقاً ترک کر دینے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ [۱۳۰] شاید اس لئے بھی کہ علامۃ الصلۃ لکھنے سے ضبط کے کئی نئے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں (جیسا کہ ابھی بیان ہو گا)۔ بیشتر مشرقی ممالک مثلاً برصغیر' چین' ایران (اور ترکی میں بھی) ہمزۃ الوصل کے لئے کسی علامت ضبط کا استعمال کافی عرصے سے متروک ہو چکا ہے۔ [۱۳۱] اور ممکن ہے برصغیر میں تو اس کا استعمال شاید متعارف ہی کبھی نہ ہوا ہو۔

☆ جن ملکوں میں علامۃ الصلۃ استعمال ہوتی ہے اس کی دو صورتیں ہیں : اکثر عرب ملکوں میں تو الخلیل والی علامت (صـ یا ص) استعمال ہوتی ہے۔ اندلس اور مغرب میں مدت تک اس کے لئے عموماً سبز رنگ کے گول نقطہ کا رواج رہا۔ [۱۳۲] بعض افریقی ممالک میں علامۃ الصلۃ کے طور پر سبز نقطے کا رواج اب بھی موجود ہے۔ نائیجریا کے بعض رنگدار مصاحف میں اس کی بہترین مثالیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں [۱۳۳]۔ آج کل عام طور پر افریقی

ممالک میں علامۃ الصلۃ کے طور پر الف الوصل کے اوپر ایک (عموماً) باریک سیاہ نقطہ ڈالا جاتا ہے۔

☆ افریقی ممالک میں الف الوصل کے ماقبل کی حرکت کے لئے بھی ایک نشان اس (الف) پر ڈالا جاتا ہے۔ اس نشان کو "صلۃ الوصل" یا "خبش الف الوصل" بھی کہتے ہیں۔ یہ عموماً ماقبل کی فتحہ کے لئے الف کے اوپر دائیں طرف ایک ہلکی سی افقی لکیر ہوتی ہے، جو کسرہ کے لئے الف کے نیچے اور ضمہ کے لئے الف کے وسط میں لگائی جاتی ہے مثلاً (ٲ ٳ ٱ)

☆ اگر ہمزۃ الوصل سے ابتداء ہو رہی ہو (مثلاً اس سے قبل قوی وقف مثل وقف لازم ہو) تو اس صورت میں ہمزۃ الوصل ہمزۃ القطع کی طرح ہی پڑھا جاتا ہے مگر اس صورت میں اس کی ممکن حرکت کے لئے عرب ممالک میں کوئی علامت نہیں ڈالی جاتی بلکہ قاری غالباً اپنی عربی دانی کے زور پر خود ہی نطق کے لئے حرکت متعین کرلیتا ہے۔ صرف سوڈانی اور لیبی مصاحف میں اس کے لئے بھی خاص علامات مقرر کی گئی ہیں اگرچہ دونوں ملکوں کی علامات میں معمولی تفاوت ہے تاہم فتحہ کے لئے یہ علامت (جو گول باریک نقطہ یا باریک سا دائرہ ہوتا ہے) الف کے اوپر، کسرہ کے لئے ٹھیک نیچے اور ضمہ کے لئے الف کے آگے (بائیں طرف) وسط میں لکھی جاتی ہے (أ ا ا· یا أ ا ا·)۔ (۱۳۴)

☆ اہل مشرق نے الف الوصل کی علامت صلہ کا استعمال ہی ترک کر دیا ہے۔ اگر الف الوصل والا لفظ ماقبل سے ملایا جا رہا ہو تو الف الوصل پر کسی قسم کی علامت نہیں ڈالی جاتی اور اگر اس سے ابتداء ہو رہی ہو تو اس الف پر علامت قطع (ء) ڈالے بغیر منطوق حرکت دے دی جاتی ہے۔ علامت قطع نہ ہونے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ہمزۃ الوصل ہے اور حرکت سے اس کے صحیح تلفظ کی طرف بھی اشارہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً عرب ممالک میں "ٱللَّهُ الصَّمَد" لکھتے ہیں مگر برصغیر میں "اَللّٰهُ الصَّمَد" لکھتے ہیں۔ پہلے طریقے پر قاری کو اللہ کے الف کی حرکت کا کچھ پتہ نہیں چلتا جبکہ دوسرے طریقے میں یہ چیز الف کی فتحہ نے واضح کر دی ہے۔ مشرق کا کوئی عام ناظرہ خوان کسی عرب ملک کے مصحف سے سورۃ الاخلاص تک درست نہیں پڑھ سکتا۔ البتہ اہل مشرق میں عموماً ہمزۃ القطع بھی بغیر علامت قطع (ء) کے لکھنے کا رواج ہو گیا مثلاً "بَأْسٌ" کو "بَاْسٌ" لکھ دیتے ہیں جو علمی لحاظ سے غلط

ہے یا پھر علامت ہمزہ کی ایجاد سے پہلے کی یادگار ہے۔

☆ ہمزۃ الوصل اور حرف زائد کے لئے علامت کے استعمال یا عدم استعمال سے اہل مشرق اور اہل مغرب کے طریقہ کتابت (یعنی ضبط) میں بڑا فرق پڑتا ہے اور اس فرق کی وجہ سے ایک علاقے کے آدمی کو دوسرے علاقے کے مصحف میں سے تلاوت کرنے میں سخت صعوبت پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "اولوا العزم" کو لیجئے۔ اس کو ضبط کرتے وقت اہل مشرق تو دونوں واو اور "لو" کے بعد آنے والے دونوں الف بھی ہر قسم کی علامت سے خالی رکھتے ہیں۔ مگر عرب اور افریقی ممالک میں "اولو" کی پہلی واو پر "علامت حرف زائد" اور "لو" کے بعد آنے والے دو الفوں میں سے پہلے پر "علامت زیادۃ" اور دوسرے پر "علامت صلہ" ڈالیں گے۔ اس طرح اس لفظ کو پہلی صورت میں "اُولُوا الْعَزْم" اور دوسری صورت میں "أُوْلُوْا الْعَزْم" لکھیں گے۔ اسی طرح اہل مشرق اُوْتُوا الْکِتٰب مگر عرب أُوْتُوْا الْکِتٰب لکھیں گے۔ جس آدمی کو "علامت صلہ" اور "علامت زیادۃ" کا علم نہیں وہ دوسری صورت والی کتابت کو کبھی درست نہیں پڑھ سکتا۔ (۱۳۵) (جاری ہے)

حواشی

۱۱۱۔ حق التلاوۃ ص ۶۸ والکلاک ص ۶۹ و ص ۱۰۴

۱۱۲۔ تاریخ القرآن ص ۲۲۳۔۱۸۳

۱۱۳۔ یہی کتاب ص ۲۱۷، سوال ۱۵

۱۱۴۔ اس روایت کو صرف صفاقسی نے کسائی کی طرف منسوب کیا ہے۔ الدانی نے التیسیر اور ابن مجاہد نے کتاب السبعہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ دیکھئے صفاقسی مطبوعہ برحاشیہ سراج القاری ص ۳۵۹۔

۱۱۵۔ الطراز ورق ۱۸۳/الف تا ورق ۸۴/ب

۱۱۶۔ اور اس بات کا اعتراف تو "الطراز" میں بھی موجود ہے۔ دیکھئے الطراز ورق ۸۳/الف۔

۱۱۷۔ اور فرق کی اس صورت کا ذکر بھی الطراز میں موجود ہے دیکھئے الطراز ورق ۸۴/الف۔

۱۱۸) وضاحت کے لئے دیکھئے مقدمہ تجویدی قرآن ص ۱۸۔

۱۱۹) ابن درستویہ ص ۱۰۵ (حاشیہ ۴۶)

۱۲۰) حروف زوائد کی تفصیل کے لئے دیکھئے حق التلاوۃ ص ۱۵۴ بعد۔

۱۲۱) المقنع ص ۱۴۰ بعد نیز الطرّاز ورق ۹۴ب ببعد۔

۱۲۲) المحکم ص ۱۹۴۔ الطرّاز ورق ۱۰۵/الف

۱۲۳) اس فرق کو اچھی طرح اور عملاً سمجھنے کے لئے کلمہ "اَفَائِنْ" یا "افائن" [آل عمران : ۱۴۴ اور الانبیاء ۳۴] کا ضبط کسی مصری یا سعودی مصحف میں اور پھر برصغیر کے کسی مصحف میں دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ تلفظ دونوں ضبط کے ساتھ ایک ہی بنتا ہے یعنی "اَفَئِنْ" جو "لَئِنْ" کی طرح ہے۔ اور اگر لَئِنْ پر قیاس کریں (جو متفق علیہ ضبط ہے) تو پھر "ی" کی بجائے الف کو زائد ماننے والوں کا موقف زیادہ قرین صواب ہے۔ واللہ اعلم

۱۲۴) تفصیل کے لئے دیکھئے غانم ص ۵۹۷ ببعد الطرّاز ورق ۱۷۱/الف بعد۔

۱۲۵) حروف محذوفہ کی نوعیت اور مزید مختلف مثالوں سے آگاہی کے لئے دیکھئے کتاب حق التلاوۃ ص ۱۴۹ تا ۱۵۳۔

۱۲۶) ہمزۃ الوصل کی تعریف اور اس کی جملہ صورتوں کے تعارف کے لئے دیکھئے الکلاک ص ۱۱۸ تا ۱۲۱ اور حق التلاوۃ ص ۳۹ تا ۴۱۔

۱۲۷) المحکم ص ۸۵ مگر نبیہ عبود نے اس کے لئے لفظ "وصلہ" استعمال کیا ہے۔ (دیکھئے عبود ص ۴۰) عربی مصادر میں یہ لفظ ان اصطلاحی معنوں کے لئے نظر سے نہیں گزرا۔

۱۲۸) نمونے کے لئے دیکھئے المحکم (مقدمۂ محقق) ص ۳۹

۱۲۹) دیکھئے یہی کتاب (المحکم) ص ۸۷ جہاں مؤلف نے ایسے دو مصاحف کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔

۱۳۰) غانم ص ۵۹۳ جہاں ترتیب زمانی کے ساتھ بعض نمونوں کا ذکر موجود ہے۔

۱۳۱) ترکی کے حافظ عثمانؓ کے مکتوبہ مصحف میں علامۃ الصلہ موجود ہے مگر مصطفیٰ نظیف اور حامد ایتاج نے اسے استعمال نہیں کیا ہے۔

۱۳۲) نمونے کے لئے دیکھئے لنگز (II) پلیٹ نمبر ۹۶ تا ۹۸۔ اسی کتاب میں پلیٹ نمبر ۴۵ دیکھئے جس میں دونوں علامات بیک وقت استعمال کی گئی ہیں۔
نیز دیکھئے قرآن کارڈ نمبر BL/COM/057

۱۳۳) حاشیہ نمبر ۷۶ کی طرف رجوع کیجئے جس میں ایسے نائیجری مصحف کا بھی ذکر ہے۔

۱۳۴) دیکھئے مصحف الجماھیریہ (التعریف بالمصحف) ص ک اور سوڈانی مصحف (بروایۃ الدوری) کا ضمیمۃ التعریف ص س۔

۱۳۵) المحکم ص ۲۴ پر الدانی نے ابن مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ علم النقط (علم الضبط) جانے بغیر

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

امریکہ میں "دعوت رجوع الی الوحی"

حکمت قرآن کے قارئین امریکہ میں مقیم ہمارے رفیق جناب باسط بلال کوشل کے خیالات سے مستفید ہوتے رہے ہیں جو اِس وقت Drew University میں پی ایچ ڈی کے طالب علم ہیں۔ دوران تعلیم انہیں ایک مخصوص علمی حلقے میں قرآن حکیم سے متعلق کئی مقالات پیش کرنے کا موقع ملا۔ یہ علمی حلقہ Society for Scriptural Reasoning یعنی "انجمن برائے استدلال بذریعہ صحف سماوی" کہلاتا ہے۔ اس انجمن میں شامل عیسائی اور یہودی اہل علم تورات' انجیل اور قرآن کی بنیاد پر ایسا علمی و فکری کام کرنا چاہتے ہیں جو مذہبی روایات کی روشنی میں اور عقل و استدلال کے جدید انداز استعمال کرتے ہوئے جدید دور کی فکری اُلجھنوں کو سلجھا سکے۔ بالفاظ دیگر اس علمی تحریک کو "دعوت رجوع الی الوحی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ باسط بلال کوشل کے خیالات سے متاثر ہو کر سامعین نے ان کے استاد ڈاکٹر اسرار احمد کو مدعو کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد نے گزشتہ سال فروری میں "علم کی اقسام" کے موضوع پر نیو جرسی میں خطاب کیا۔ بعد ازاں نومبر میں فلوریڈا میں "حقیقت تصوف" پر خطاب کیا۔ مندرجہ ذیل تحریر اس انجمن کے ایک اہم رکن پروفیسر پیٹر اوکس کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ مزید پس منظر جاننے کے خواہش مند قارئین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے انگریزی سہ ماہی مجلّہ The Quranic Horizons کے اپریل۔جون اور اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

"انجمن برائے استدلال بذریعہ صحف سماوی" یہودیت' اسلام اور مسیحیت کے پیروؤں کو دعوتِ عام دے کر اور یکجا کر کے اس امر کی کوشش میں مصروف ہے کہ مذہب کی جانب سے ورائے جدیدیت (یعنی Post-Modernism) کے تقاضوں کو علمی سطح پر پورا کیا جائے۔ اس دعوت کے نتیجے میں آسمانی کتابوں کے علماء' الٰہیات کے ماہرین' سائنس دان' فلسفی اور مذہبی پیشوا سب شامل ہوئے ہیں جو آسمان و زمین کے خالق خدائے واحد پر یقین رکھتے ہیں' اور اس کے ساتھ خدا کے پیغمبروں اور اس کی ان مقدس آسمانی کتابوں پر بھی پورا یقین رکھتے ہیں جن کے گرد تین بڑے مذاہب کے پیرو کار

جمع ہوئے ہیں۔ اس انجمن کے شرکاء آج کے علمی و سائنسی اداروں کی مخصوص زبانوں اور طریقہ ہائے کار کو خود بھی استعمال کرتے ہیں اور ان کے ساتھ دو طرفہ رابطہ بھی رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اداروں سے مذاہب کے پیرو کار جدید معاشرے میں رہتے ہوئے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ مسلمان، یہودی اور عیسائی سب کے سب خداوند کریم کی پیدا کردہ دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کی تخلیقات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس مطالعے اور مشاہدے کے لئے وہ تمام ممکن ذرائع استعمال کرتے ہیں، بشمول ان ذرائع کے جو جدید سائنس اور جدید علمی طریقہ کار نے فراہم کئے ہیں۔

درحقیقت مسلمان، عیسائی اور یہودی اکثر یونیورسٹی کے علمی ماحول ہی میں پہلی مرتبہ باہم مل بیٹھنے کا موقع پاتے ہیں جہاں انہیں یونیورسٹی میں مستعمل مختلف علمی طریقہ ہائے کار کی وساطت سے اُن مخصوص زبانوں (یعنی اظہار کے طریقوں) کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے معنی خیز تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔

جدید یونیورسٹی نے ازمنہ وسطیٰ میں جنم لیا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب یونیورسٹی کی سطح پر سائنس، قانون، منطق اور طب کے شعبوں میں ایسے طریقہ ہائے اظہار استعمال ہوتے تھے جن کے ذریعے مذہبی افراد بیک وقت خالق اور اس کی تخلیق سے متعلق علمی گفتگو کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مخصوص زبانیں یا یہ طریقہ ہائے اظہار عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے مابین مذہبی فہم کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ثابت ہوئے۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کے درمیانی دور سے لے کر اواخر تک کا ذکر ہے۔ اگرچہ ان مخصوص زبانوں کو مذہبی مسابقت اور عدم رواداری کا وسیلہ بھی بنایا گیا، لیکن بدقسمتی سے جدید محققین اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ میں مسلمان، یہودی اور عیسائی مفکرین کے علمی مباحثے اور باہمی تبادلہ خیال کی بدولت کس طرح اور کس درجے تک سائنس، الٰہیات اور تصوف جیسے علوم کو تقویت پہنچی اور فروغ حاصل ہوا۔

گزشتہ دو سو سال کے دوران (بعض ممالک میں چار سو سال سے) علمی تحقیق کا طریقہ اظہار رفتہ رفتہ لامذہبیت اختیار کرتا رہا ہے۔ یہ رجحان جسے secularization کہتے ہیں، بعض مفید نتائج کا سبب بھی بنا۔ مثلاً اس نے بعض کم تر علمی سطح کے مذہبی ذہنوں کو سائنسی تحقیق کے لئے آزاد کر دیا اور انہیں اس مذہبی جذباتیت سے نجات دی جو اکثر

سائنسی تحقیق کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اسی طرح علمی تحقیق کے میدان میں لامذہبیت کے رجحان کا ایک مفید نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ظالم حکمرانوں کے لئے یہ موقع نہ رہا کہ وہ مذہبی اصطلاحات کا سہارا لے کر عوامی رائے اور عوامی جذبات کو سنجیدہ مفکرین اور مصلحین کی اصلاحی کوششوں کے خلاف استعمال کر سکیں۔ تاہم یہ بات لازماً پیش نظر رہنا چاہئے کہ لامذہبیت کے رجحان نے بہت سے بُرے اثرات بھی پیدا کئے۔ ان بُرے اثرات میں سرفہرست وہ تقسیم (dichotomy) ہے جو خالق کائنات سے متعلق مذہبی طریقہ اظہار اور کائنات سے متعلق غیر مذہبی طریقہ اظہار کے مابین پیدا ہو گئی۔ اسی کا ایک ضمنی شاخسانہ یہ ہے کہ "عالم تخلیق" یا creation کو "عالم فطرت" یا nature کا نام دے دیا گیا۔ گزشتہ دو سو سال کے دوران علم جدید نے "عالم فطرت" کے عقلی و استدلالی (rational) مُطالعہ کا کام سنبھال لیا اور خالق کائنات (نیز عالم فطرت بحیثیت مخلوق خداوندی) سے متعلق علم کو غیر عقلی (non-rational) قرار دے کر اور گویا کم تر سطح کا کام سمجھ کر مذہب کے حوالے کر دیا۔ یہ غیر فطری تقسیم اور طریقہ اظہار کا اس طرح دولخت ہو جانا علمی تحقیق کے لئے بھی اسی طرح مضر ہے جس طرح مذہب کے لئے۔ اگر عالم فطرت کا رشتہ مذہبی روایات کے طریقہ ہائے اظہار سے منقطع کر دیا جائے تو اس کا تعلق خود طریقہ اظہار اور ان اقدار و ضوابط سے بھی کٹ جاتا ہے جنہیں ان طریقہ ہائے اظہار کے وسیلے سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ فطرت کی سچائی کو مذہب کی زبان میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مذہب اور سائنس کی اس تقسیم نے خود علمی تحقیق کو کسی ایسے قابل اعتماد اور مشترکہ ذریعے سے بھی محروم کر دیا جس کی بدولت عالم فطرت کے حقائق کا رشتہ انسانی اقدار اور اخلاق سے جوڑا جا سکتا ہے۔

"استدلال بذریعہ صحف سماوی" سے مراد یہ ہے کہ علماء و حکماء اپنے اپنے مذہب کی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تورات، انجیل، اور قرآن کا مطالعہ اس طور سے کریں کہ جدید علمی حلقوں میں پائی جانے والی لامذہبیت کی اصلاح ہو سکے۔ اس کام کے لئے ہماری انجمن کو ان اہل دانش کی علمی تخلیقات سے مدد ملی ہے جنہوں نے پہلے ہی سے صحف سماوی کی ہدایت کو محور بنا کر سائنسی اور عقلی استدلال پیش کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے۔ یہ انجمن ۱۹۹۵ء میں قائم ہوئی اور ابتداء ہی سے یہ امر اس کے پیش نظر تھا کہ

مسلمان، یہودی اور عیسائی مفکرین کو اس تبادلہ خیال میں شامل کیا جائے گا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں فلسفیانہ الٰہیات (Philosophic Theology) کے پروان چڑھنے اور پھیلنے پھولنے میں اسلامی الٰہیات، فلسفہ اور شاعری نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہیں آج کے دور میں دوبارہ ایک اہم کردار ادا کرنا ہے تاکہ علم جدید کی اصلاح کی جا سکے۔ تاہم لامذہبی علمی حلقوں نے اس منبع علم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا اور نتیجتاً آج کے دور میں عیسائی اور یہودی مفکرین کو علمی تبادلۂ خیال کے لئے اسی نصب العین کے حامل مسلم حکماء کو تلاش کرنے میں کافی دشواری پیش آئی۔ خدا کا شکر ہے کہ تلاش و جستجو کے تین برس بعد ہماری انجمن نے بالآخر مسلم مفکرین کے ایک ایسے حلقے کو تلاش کر لیا ہے جو اس اہم کام میں شمولیت کے لئے تیار تھا۔ یہ وہ اہل علم و فکر ہیں جنہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد سے فیض علمی حاصل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو علمی کام ہمارے پیش نظر ہے وہ سرگرم مسلم مفکرین کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں ہو گا۔ جدید لامذہبی علم کی اصلاح کی کوشش اُسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہو سکے گی جب اس میں یہودی اور عیسائی مفکرین کے ساتھ ساتھ مسلم مفکرین کی آواز بھی شامل ہو۔ تینوں مذہبی روایات میں ایک ہی خدائے واحد مختلف طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ امریکہ کے علمی حلقوں میں خدائے واحد کے کلام سے متعلق تبادلۂ خیال میں اب ڈاکٹر اسرار احمد کے شاگرد اور علامہ اقبال کے پیروکار بھی اہم کردار ادا کریں گے اور دوسری آوازوں میں ان کی آواز بھی توجہ سے سنی جائے گی۔ اب مسلم مفکرین کی جانب سے بھی پیش نظر علمی کام میں شمولیت ممکن ہو گی۔ مثال کے طور پر ان کے ذریعے دیگر مذاہب کے مقابلے میں عالم مخلوقات میں خدا کی شان کا اظہار زیادہ بہتر طور پر واضح ہو گا۔ اسی طرح ایک جانب الٰہیات اور سائنس اور دوسری طرف پرہیزگاری یا خدا ترسی اور روزمرہ کے رویئے کا تعلق واضح ہو گا۔

اس سلسلے کا نقطہ عروج ہماری انجمن کے سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر اسرار احمد کی شرکت تھی جو نومبر ۱۹۹۸ء میں American Academy of Religion کے کنونشن کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ اس موقعہ پر چوٹی کے تقریباً پینیالیس مذہبی مفکرین نے انجمن کے بنیادی علمی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی شرکت پر ان کا خیر مقدم کیا۔ ان عیسائی اور یہودی مفکرین کا تعلق امریکہ اور یورپ کی نامور جامعات سے ہے۔

اجلاس کی صدارت کیمبرج کے Rev. Daniel Hardy نے کی۔ کیمبرج کے David Ford نے مسیحی تصوف اور پرنسٹن کے Jacob Meskin نے نیویارک یونیورسٹی کے Elliot Wolfon کا یہودی تصوف سے متعلق مقالہ پیش کیا۔

بعد ازاں ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی تصوف کے موضوع پر پُر مغز تقریر کی۔ انجمن کے یہودی اور عیسائی ارکان نے بعد میں اپنے اس گہرے تاثر کا اظہار کیا کہ اس نئی آواز کے حوالے سے ان کے سامنے مذہبی پرہیز گاری اور فلسفیانہ استدلال کا امتزاج سامنے آیا ہے۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ انجمن کے کام میں قرآن کی تفسیر و تعبیر مرکزی اہمیت کی حامل ہوگی۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار احمد کے شاگردوں کی موجودگی نے انجمن کے شرکاء کے ذہنوں کو انجمن کے آئندہ منصوبوں کی طرف منتقل کیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب سے متعلق گفتگو اور تبادلۂ خیال میں ان کے دو شاگردوں باسط بلال کوشل اور عرفان اقبال نے مذہب' فلسفہ اور صحف سماوی کی تعبیر کے حوالے سے علمی آراء پیش کیں۔ انجمن کے ارکان نے محسوس کیا کہ انجمن کے کام میں امریکہ میں ڈاکٹر اسرار احمد کے قائم کردہ ادارے Institute of Quranic Wisdom کے رفقاء اہم کردار ادا کریں گے۔ انجمن کا کام صحیح معنوں میں اب شروع ہوا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس حلقے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی آمد سے گہری تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اگر انجمن کی کوششیں مزید فروغ پاتی ہیں تو ہمیں امید ہے کہ خداوند کریم کی مدد سے ان کی آمد مذہب سے متعلق اعلیٰ علمی سطح پر ہونے والے تبادلۂ خیال میں بھی اہم تبدیلیوں کا باعث بنے گی۔ انجمن کا آئندہ سالانہ اجلاس امریکہ کے شہر بوسٹن میں ہوگا جو ڈاکٹر اسرار احمد کے شاگردوں اور علامہ اقبال کے تلامذہ کے لئے اسلامی فلسفے پر گفتگو کا اہم موقع فراہم کرے گا۔

آخر میں' مَیں اپنی ایک ذاتی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں: خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ ڈاکٹر اسرار احمد پر اپنی برکات نازل فرمائے۔ میں انہیں اپنے محبوب اساتذہ کی فہرست میں شامل کرنا چاہوں گا۔ خدا کرے کہ ہم اسی طرح ان کے دوروں سے مستفیض اور ان کے خیالات سے بہرہ مند ہوتے رہیں۔

قرآن کالج کی تقسیم اسناد کی پُروقار تقریب میں
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب

مرتب : ذیشان دانش خان

قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس دینی اور دنیاوی تعلیم کا بہترین سنگم ہے۔ کالج ہذا میں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور ہر سال طلبہ میں علمی، تحریری، تقریری، ذہنی اور جسمانی مقابلے کروائے جاتے ہیں۔ ۲۰/اپریل ۹۹ء کو کالج میں تقسیم انعامات کی پروقار تقریب ہوئی، جس میں قرآن کالج کے صدر مؤسس اور امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز ٹھیک ۱۰ بجے تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں ہدیۂ نعت اور کلامِ اقبال پیش کیا گیا۔ بعد ازاں قرآن کالج کے پرنسپل جناب نجم الزمان صاحب نے کالج رپورٹ پیش کی اور کالج کا تعارف کرایا۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب

مہمان خصوصی اور صدر مجلس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ میں بہت عرصے بعد کالج کی تقریب میں شریک ہوا ہوں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ میں قرآن کالج کے اغراض و مقاصد بیان کروں اور یہ کہ یہ دوسرے کالجوں سے منفرد کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ دنیا ایک Global Village کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا کو سائنسدان چلا رہے ہیں یا عالم انسانیت کے معاملات کی اصل باگ ڈور علوم عمرانی (Social Sciences) یا علوم انسانی (Humanities) کے ماہرین کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علوم طبیعی (PhysicalSciences) اور مختلف پیشہ ورانہ علوم و فنون کے ماہرین درحقیقت فلسفہ و نفسیات، معاشیات و سیاسیات، عمرانیات اور ماہرین قانون کے تابع رہ کر خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اب غور کیجئے قائداعظم اور علامہ اقبال سائنسدان نہیں تھے بلکہ وہ مفکرین تھے۔ انہوں نے اپنے نظریات کے ذریعے مسلمانان ہند کی آزادی کی جنگ جیتی۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ معاشرہ کفر اور مادہ پرستی میں مبتلا ہے۔ کیونکہ اس معاشرے کو چلانے والے لوگوں کے نظریات الحاد اور مادہ پرستی کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ ہمیں ان تک قرآن کے نظریات کو فلسفیانہ، حکیمانہ اور مدلل انداز میں پہنچانا ہے اور ان پر یہ حقیقت واضح کرنی ہے کہ اصل مالک، حاکم اور خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہم تو اس کے خلیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ آسان کام نہیں۔ کیونکہ اگر آپ پانی کے رُخ پر تیرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت آسان ہو گا، لیکن اس کے مخالف تیرنا بہت مشکل ہوتا ہے، جب کہ اس سے بھی مشکل کام اس کا رُخ موڑنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ایسے باہمت نوجوانوں کی کھیپ تیار کی جائے جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ، معاشیات اور سیاسیات جیسے عمرانی علوم میں مہارت رکھتے ہوں۔ ایسے باہمت اور علم و حکمت سے آشنا لوگ ہی قرآنی فکر کو عام و خاص تک پہنچا سکتے ہیں۔

آج سے بارہ برس قبل قرآن کالج کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا کہ عمرانی علوم اور قرآنی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ ہمیں اُس وقت بھی معلوم تھا کہ ہمیں طلبہ نہیں ملیں گے کیونکہ طلبہ کا رجحان فزیکل سائنس، مینجمنٹ

سائنس اور کمپیوٹر سائنس کی طرف ہے۔ بلکہ ایسے طلبہ ملیں گے جنہیں دوسرے کالجوں میں داخلہ نہیں ملے گا۔ پھر بھی ہم نے قرآن حکیم کی آیت ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ﴾ کے مصداق یہ کالج علیٰ وجہ البصیرۃ قائم کیا تاکہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا جائے۔ کچھ لوگوں نے قرآن کالج کے نام سے یہ سمجھا کہ یہ کوئی دینی مدرسہ ہے۔ اس لئے ہم نے اب اس کے نام کے ساتھ آرٹس اینڈ سائنس کا اضافہ کیا ہے' جبکہ آج کی تقریب میں یہ جان کر مسرت ہوئی کہ قرآن کالج میں مارشل آرٹس بھی شامل ہو گیا ہے جو ایک لحاظ سے اہم قدم ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے :

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد نے فرمایا کہ ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا قیام علامہ اقبال کے خواب کا پہلا ظہور ہے۔ اس کے بعد اقبال کی مثالی یونیورسٹی کا تصور قرآن کالج کی شکل میں موجود ہے جو رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور نظر آ رہا ہے کہ یہ شجر برگ و بار لانے کو ہے۔ قرآن کالج کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قرآن کالج میں پڑھنے کی وجہ سے ان کا مستقبل تاریک نہیں ہوا بلکہ وہ عمرانی علوم میں سے کسی ایک میں ایم اے کر کے ایجوکیشنل کیریئر اختیار کر سکتے ہیں اور پھر پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ وغیرہ کر کے اس شعبے میں قرآن حکیم کی ہدایت و رہنمائی کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنے کی دینی ذمہ داری پوری کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سی ایس ایس وغیرہ کے امتحانات پاس کر کے حکومت کے انتظامی شعبوں میں خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنی سرکاری حیثیت کے مطابق لوگوں کی دینی رہنمائی اور تبلیغ کا فریضہ بھی سرانجام دے سکتے ہیں یا ایل ایل بی کر کے وکالت کا شغل بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جلد یا بدیر اس ملک میں اسلامی قانون نافذ ہو کر رہے گا۔ اس وقت ایسے ماہرین کی شدید ضرورت ہو گی جو دینی علوم اور قوانین پر میں دسترس رکھتے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انسان کو اپنا ہدف اونچا رکھنا چاہئے کیونکہ انسان کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ جس طرح زمین کے نیچے موجود خزانے کا حصول زمین کھودنے پر ہی ہو سکتا ہے' بعینہٖ ایک مومن اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو محنت سے بیدار کر کے دین و دنیا میں کامران ہو سکتا ہے۔

بقیہ : دین ابراہیمؑ اور ریاست اسرائیل

ان مباحث سے جو نتیجہ ہم اخذ کریں گے وہ مسلمانوں کے اسرائیل کی یہودی ریاست کو تسلیم کرنے کے نتائج کو ہمارے سامنے واضح کر دے گا۔ (جاری ہے)

حواشی

۱) مصنف کی کتاب "قرآن و سنت میں ربا کی ممانعت" مسجد دارالقرآن نیویارک۔ ۱۹۹۷ء' صفحہ ۱۲

۲) اسمٰعیل راجی الفاروقی کی کتاب "اسلام اور مسئلہ اسرائیل" اسلامک کونسل آف یورپ۔ ۱۹۸۰ء/ آرگراوی کی کتاب "اسرائیل کا مقدمہ۔ سیاسی صیہونیت کا مطالعہ" شروک انٹرنیشنل۔ ۱۹۸۳ء

۳) مصنف کی کتاب "خلافت' حجاز اور سعودی وہابی قومی ریاست" مسجد دارالقرآن نیویارک۔ ۱۹۹۵ء

۴) شرک : القرآن

بقیہ : حقیقتِ ایمان

دوسری طرف فقہاءِ احناف کا قول ہے : "الایمان قولٌ و تصدیقٌ لا یزید و لا ینقص" کہ "ایمان قول و تصدیق کا نام ہے نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے"۔ ان حضرات کی مُراد حقیقی ایمان نہیں بلکہ قانونی ایمان ہے۔ کیونکہ ایک طرف نیک اور متقی مسلمان اور دوسری طرف فاسق و فاجر مسلمان کے قانونی حقوق برابر ہیں۔ مثلاً ایک باپ کے دو بیٹے ہوں' ایک تقویٰ کے انتہا پر ہو اور دوسرا گناہوں کی انتہا پر' تو پھر بھی دونوں کو وراثت میں حصہ برابر ملے گا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ محدثین کرام نے حقیقی ایمان کی بات کی ہے اور فقہاءِ احناف نے قانونی ایمان کی۔ دونوں کی بات شدید بُعد اور دوری کے باوجود غلط نہیں ہے کیونکہ دونوں نے اپنے اپنے زاویے سے بات کی ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

۱) فتح الباری ۱/۶۰ کتاب الایمان۔ طالریان۔ مصر

۲) صحیح البخاری اور صحیح مسلم بروایت ابو ہریرہ و عمر رضی اللہ عنہما

۳) دیگر مسلکوں کا ذکر اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ وہ تقریباً فی زمانہ دنیا سے ناپید ہو گئے ہیں' صرف محدثین یا فقہاءِ احناف موجود ہیں یا فی الواقع شیعہ۔

۴) یہ محترم ڈاکٹر اسرار صاحب کی رائے ہے۔ تمام ائمہ و محدثین کے نزدیک حالت گناہ میں اس کا ایمان اوپر معلق رہتا ہے اور بعد میں کمزور ہو کر لوٹ آتا ہے اور اگر وہ توبہ و استغفار کر لے تو اپنی اصل حالت پر آ جائے گا ورنہ کمزور ہی رہے گا اور اسی رائے کی میں تائید کرتا ہوں۔
(ابو عبدالرحمٰن شبیر)

بقیہ : کتابت مصاحف اور علمِ ضبط

کسی مصحف سے قراءت ناممکن سی بات ہے۔ یہی بات آج بھی سو فیصد درست ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حرمین شریفین میں سب لوگوں کو دیارِ عرب ہی کے مطبوعہ مصاحف سے تلاوت پر مجبور کرنا ناظرہ خوانوں پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ اہل علم کے لئے تو خیر کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ "وَقلیل ماھم"

☆ مراحل انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے سیرتِ مطہرہ کا ایک منفرد مطالعہ

☆ اسلامی انقلاب کیلئے سرگرم عمل افراد کیلئے مشعل راہ

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ** کے گیارہ خطبات پر مشتمل ایک فکر انگیز کتاب

منہج انقلابِ نبویؐ

کا نیا ایڈیشن، جو حسن ظاہری ہی نہیں حسن معنوی کے اعتبار سے بھی سابقہ ایڈیشن پر فوقیت رکھتا ہے، چھپ کر آ گیا ہے۔

خوبصورت کمپیوٹر کمپوزنگ، عمدہ طباعت، چار رنگوں میں شائع شدہ دیدہ زیب سرورق،

صفحات : 375

قیمت (غیر مجلد) : 140 روپے

(مجلد) : 160 روپے

شائع کردہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 03-5869501